ہم اور اقبال

مصنف

ڈاکٹر علی شریعتی

ترجمہ

جاوید اقبال قزلباش

مصحح

ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

ناشر

دفتر ثقافتی قونصلر اسلامی جمہوریہ ایران اسلام آباد

کتاب کا نام: ہم اور اقبال
مصنف: ڈاکٹر علی شریعتی
مترجم: جاوید اقبال قزلباش
مصحح: ڈاکٹر سید علی رضا نقوی
ناشر: دفتر ثقافتی قونصلر سفارت اسلامی جمہوریۂ ایران۔ اسلام آباد
مطبع: نوبل پرنٹرز۔ راولپنڈی
سال اشاعت: ۱۳۷۴ش/ ۱۴۱۶ق/ ۱۹۹۶ء
تعداد: ۱۰۰۰
قیمت: ۷۰ روپے

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

فہرست

عنوان	صفحہ
مقدمہ (فارسی)	۷
مقدمہ (اردو)	۱۱
ہم اور اقبال ۔ حصہ اول	
دورِ حاضر میں مسلمان کا تشخص اور اس کی تکالیف اور استفسارات	۲۱
میری بیسویں صدی کے آلام	۲۳
پراگندہ اسلام اور منتشر علیؑ	۲۵
عمارت کی تجدید	۲۹
ہم اور اقبال ۔ حصہ دوم	
بیسویں صدی	۱۰۷
جہاں شناسی	۱۲۱

مقدمه

آسمان مشرق زمین، در سده اخیر، با بازگشت مصلحان، علماء و روشنفکرانی اصیل و متعهد به اسلام ناب، ستاره‌های درخشانی را به خود دید. درخشش این ستاره‌ها، خواب چند صد سالهٔ استعمارکهن غرب را آشفته کرد و نهضت بیداری مسلمین را به دنبال داشت و راهی را برای مسلمانان گشود، که هنوز هم روندگان آن در مقابله با اقسام تهاجم های استعمار غرب، روز به روز بر استحکام خود می افزایند و امواج بیداری مسلمین، سواحل امن غارت حکام و غفلت مغرب زمینیان را نیز تهدید می کند. چهره‌هایی در آفریقای مسلمان، خاورمیانه و شبه قارهٔ هند و پاکستان در این آسمان درخشیدند و برخی برجستگی خاصی پیدا کردند که علامه اقبال، یکی از این چهره ها است.

نیم قرن پس از اقبال، از همین قبیله مصلحان و بیدارگران اقالیم قبله، نوری درخشید که همهٔ صداهای خفته درگلوها را فریاد کرد و به آرمان های

بلند این مصلحان جامهٔ عمل پوشاند.

ستاره ای بدرخشید و ماه مجلس شد

بدر منور این آسمان، راست قامت همیشه تاریخ و شاه بیت این قصیده بلند، امام خمینی رضوان الله تعالی علیه بود که همچنان راه او در اقطار عالم، پیموده میشود.

بدون تردید علامه محمد اقبال، یکی از میوه‌های شجره طیبه اسلام در قرن معاصر است. او ستاره‌ای است در آسمان اندیشمندان و مصلحان صاحب درد که پیام و کلام او ریشه در اقیانوس مکتب وحی الهی دارد.

از آن نوری که از قرآن گرفتم سحر کردم صدوسی ساله شب را

اگرچه حدود شصت سال از افول جسمانی و ظاهری او می گذرد ولی اشراق و ظهور معنوی او هنوز در سپیده دم است، ظهوری که یکی از جلوه های ظهور مجدد اندیشهٔ اسلامی و دینی در پایان هزارهٔ دوم میلادی است.

ای بسا شاعر که بعد از مرگ زاد چشم خود بر بست و چشم ما گشاد
رخت باز از نیستی بیرون کشید چون گل از خاک مزار خود دمید

او کسی است که افراد زیادی دربارهٔ او قلم زده اند و هرکدام از زاویه‌ای او را نگریسته‌اند. زیبا ترین و رساترین تعبیری که در این سال ها دربارهٔ علامه اقبال بیان شده است، تعبیر کسی است که "سالها مرید او بوده" و در زمانی هم که در مسند رئیس یک کشور بزرگ اسلامی دربارهٔ اقبال سخن گفته است، این ارادت را پنهان نکرده و امروز هم در کسوت رهبری انقلاب اسلامی، پیشتاز

نهضت بیداری مسلمین است. او اقبال را "ستارهٔ بلند شرق"[۱] نامید و این لقب برای "اقبال"، جز بیان حقیقت، نیست.

دکتر شریعتی نیز یکی از مریدان و الهام گرفتگان از اقبال است. او اندیشه ها و احساسات اسلام خواهی و ندای "بازگشت به خویشتن" خود را در زمان حاکمیت ظلم و ظلمت در ام القرای امروز اسلام، فرا راه جویندگان حق قرارداد و بویژه زاویه نگاه او به اقبال، نکات آموزنده فراوانی دارد که امروز هم مورد نیاز و استفاده "اقبال دوستان" است. کتابی که بنام "ما و اقبال" پس از او منتشر شده حاوی دو دفتر است. دفتر اول سخنرانی دکتر شریعتی است درکنگرهٔ اقبال (در سال ۱۳۴۹ ش) که توسط حسینیه ارشاد در تهران برگزار شد و دفتر دوم، نوشته هائی است که گردآورندگان آثار او آن را بنام "ما و اقبال" در این کتاب، آورده اند.

ترجمه‌ای که پیش روی شما است، ترجمه همراه با تلخیص و تصرف دفتر اول و بخشی از دفتر دوم است که به اقبال و شناخت ابعاد اندیشه او مربوط میشود. بخش اعظم دفتر دوم در متن اصلی کتاب، که ترجمه نشده است، بیشتر به تحلیل جامعه شناسانه دین در جامعهٔ آن روز ایران مربوط میشود و لذا برای مخاطبان پاکستانی چندان مفهوم و قابل استفاده نمی باشد. در این تلخیص و تصرف، مطالبی که غالباً به عنوان موضوعات و جملات معترضهٔ طولانی درمیان مطالب کتاب آمده و یا تمثیل ها و شواهدی که بخصوص برای خوانندهٔ اردو زبان مفهوم نمی باشد و بویژه برای جوان یا نوجوانی که با تاریخ و جامعه و کنایات و اشارات ایرانی و فارسی متن، غریب است، حذف شده و اگرچه در همین محذوفات، نکات بدیع یا اشارات مفیدی برای اهل سخن و محققین اهل درد، وجود دارد، ولی هدف اصلی این ترجمه، آشنا

---

۱ - "اقبال، ستاره بلند شرق" موضوع سخنرانی حضرت آیة الله خامنه‌ای در کنگره بزرگداشت اقبال در تهران (سال ۱۹۸٦م) در زمان تصدی ریاست جمهوری اسلامی ایران ترجمه به اردو و انگلیسی چاپ ۱۹۹۴ م لاهور ناشر اکادمی اقبال لاهور پاکستان با همکاری خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در لاهور.

شدن اقبال دوستان هموطن اقبال است با نگاهی که یکی از مریدان اقبال به مراد خود دارد. و حیف بود که با عدم تصرف و تلخیص متن، راه را برای بهره برداری "اقبال دوستان جوان" از این نوشته ببندیم.

در همین جا لازم است از جناب آقای جاوید اقبال قزلباش و جناب آقای دکتر علیرضا نقوی که زحمت ترجمه و تصحیح را برعهده گرفتند، سپاسگزاری و تقدیر شود.

رایزنی فرهنگی و خانه های فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در پاکستان به عنوان یک وظیفه، همواره یاد اقبال، آثار اقبال، افکار و اندیشه های اقبال را در سرزمین اقبال گرامی داشته و تلاش های مفیدی را با همکاری ایران دوستان و اقبال دوستان پاکستانی برای احیاء و گسترش اندیشه های اقبال، انجام داده اند. و اکنون که چهلمین سال انعقاد قرارداد رسمی فرهنگی بین دو کشور اسلامی پاکستان و ایران می باشد، این ترجمه را در اختیار ارادتمندان و دوستداران اقبال قرار می دهد. البته روابط طبیعی فرهنگی بین این دو خطه، سابقه ای چند هزار ساله دارد. نزدیکی و شباهت و تبادل فرهنگی عمیق و ریشه دار بین دو ملت ایران و پاکستان، کمتر مورد مشابهی در سطح جهان دارد. نشر این کتاب به این مناسبت، بدین معنی است که ما همهٔ اشتراکاتمان را می توانیم در "اقبال" خلاصه کنیم. اشتراک تاریخی ، زبانی ، فرهنگی، دینی و مهم تر از همه اشتراک قلبی و آرمانی بین دو ملت، در افکار عمیق و بلند علامه اقبال تبلور عینی یافته است. اقبال، سرمایهٔ مشترک ما است و الهام بخش راهی که مسلمین را می تواند به شکوه و مجد بایسته خود برساند.

اقبال، نیاز امروز ما است و هنوز برای شناخت اقبال و شناساندن او باید تلاش ها کرد. آنهم نه از روی انجام یک وظیفهٔ اداری و رسمی، که به عنوان یک تکلیف الهی ، انسانی و ملی.

علی ذوعلم
رایزن و نمایندهٔ فرهنگی ج.ا.ا - پاکستان

مقدمہ

مشرق کی سرزمین کے آسمان پر موجود صدی میں خالص اسلام سے وابستہ اور اصلی مصلح ، عالم اور روشن خیال افراد کی پیدائش کی صورت میں درخشان ستارے نمودار ہوئے ۔ان ستاروں کی چمک دمک نے مغرب کے چند سو سالہ قدیم استعمار کے خواب کو پریشان کردیا اور مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کو چلایا اور مسلمانوں کے لئے راستہ ہموار کیا کہ آج بھی اس راہ پر چلنے والے مغربی استعمار کے مختلف حملوں کا مقابلہ کرتے وقت روز بہ روز اپنی ثابت قدمی کو مزید مستحکم تر کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی بیداری کی امواج اہل زمین مغرب کے حکام اور غفلت کے ہاتھوں امن کی غارتگری کے ساحلوں کے لئے بھی خطرہ کا باعث بن گئ ہیں ۔

مسلمان افریقہ، مشرق وسطیٰ اور برصغیر ہندو پاکستان میں اس آسمان پر جو چہرے درخشان ہوئے ان میں سے بعض چہروں نے خاص ممتاز مقام حاصل کرلیا کہ علامہ اقبالؒ ان چہروں میں سے ایک ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے تقریباً نصف صدی بعد مسلمان ممالک کے مصلحین اور بیدارگروں کے اسی قبیلہ سے ایک نور پھوٹا جس نے خلق میں خوابیدہ ساری صداؤں کو ایک فریاد کی صورت بخشی اور ان مصلحین کے بلند مقاصد کو جامہ عمل پہنایا۔

ستارہ ای بدرخشید وماہ مجلس شد

(ایک ستارہ چمکا اور محفل کا چاند بن گیا)۔

اس آسمان کا بدر منیر اور تاریخ میں ہمیشہ بلند قامت فرد اور اس عظیم قصیدہ کا شاہ بیت (اہم ترین شعر) امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ دنیا کے تمام گوشہ و کنار میں لوگ بدستور حق کی راہ پر گامزن ہیں۔

بلاشک وترید علامہ اقبالؒ اس صدی کے اسلامی شجرہ طیبہ کے پھلوں میں سے ہیں، وہ اہل درد مفکرین اور مصلحین کے آسمان کا ایک ستارہ ہیں جس کا سرچشمہ پیام اور کلام وحی الہیٰ کے مکتب کا بحر اوقیانوس ہے

ازآن نوری کہ از قرآن گرفتم
سحر کردم صد وسی سالہ شب را

(اس نور سے جو میں نے قرآن سے کسب کیا ایک سو تیس سالہ رات کو صبح میں بدل دیا)۔

اگرچہ تقریباً ساٹھ سال ہوئے کہ یہ ستارہ جسمانی اور ظاہری طور پر غروب ہو چکا ہے

لیکن اس کی تجلیاں اور معنوی ظہور اب بھی سفیدی صبح میں جلوہ گر ہیں ، ایسا ظہور جو دوسرے عیسوی ہزارہ کے اختتام پر اسلامی اور دینی فکر کے جدید ظہور کے جلووں میں سے ایک ہے ۔

ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد — چشم خود بر بست و چشم ما گشاد
رخت باز از نیستی بیرون کشید — چون گل از خاک مزار خود دمید

(کتنے ہی شاعر ایسے ہیں کہ اپنی وفات کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں تو موند لیں لیکن ہماری آنکھیں کھول دیں ۔ انہوں نے عدم سے دوبارہ ظہور کیا اور پھول کی طرح اپنے مزار کی مٹی سے رونما ہوئے) ۔

علامہ اقبالؒ ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے بارے میں متعدد اشخاص نے قلم اٹھایا ہے اور ہر ایک نے ایک خاص زاویہ ، نظر سے ان کو دیکھا ہے ۔ ان چند سالوں میں علامہ اقبالؒ کی حسین ترین اور جامع ترین تعبیر اس عظیم شخص کی تعبیر ہے " جو سالوں ان کے مرید رہے " اور اس وقت بھی جبکہ وہ ایک عظیم اسلامی مملکت کے سربراہ ہیں انہوں نے علامہ اقبالؒ کے بارے میں بیان دیا ہے کہ ان سے اپنی عقیدت کو چھپایا نہیں ہے درحالاں کہ آج بھی وہ اسلامی انقلاب کے رہبر کے لباس میں مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کے پیشوا ہیں انہوں نے علامہ اقبالؒ کو " مشرق کا بلند ستارہ " ① کہا ہے اور اقبالؒ کے لئے یہ لقب حقیقت کے بیان کے سوا کچھ نہیں ۔

---

۱ ۔ اقبال " ستارہ بلند شرق " حضرت آیت اللہ خامنہ ای کی تقریر کا عنوان ہے جو انہوں نے تہران میں علامہ اقبالؒ کانفرنس (منعقدہ سال ۱۹۸۶ء) میں کی تھی جس وقت وہ ایران کی اسلامی جمہوریہ کے صدر تھے ۔ اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ اقبال اکیڈیمی پاکستان لاہور نے خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران لاہور کے تعاون سے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ۔

ڈاکٹر شریعتی بھی ان اشخاص میں سے ایک ہیں جن کو علامہ اقبالؒ سے والہانہ عقیدت ہے اور جنہوں نے ان سے الہام حاصل کیا ہے اور اپنے اسلام طلبی کے افکار اور جذبات "خود کی طرف واپسی" کے نعرے کو آج کے اسلام کے ام القری (سب سے اہم شہر) میں ظلم اور تاریکی کی حاکمیت کے زمانہ میں حق طلبوں کے سامنے رکھا اور خاص طور سے اقبالؒ کے بارے میں ان کا زاویہ نظر نہایت درس آمیز نکات کا حامل ہے جو آج بھی اقبالؒ کے دوست داروں کے لئے ضروری اور قابل استفادہ ہیں "ماواقبالؒ" (ہم اور اقبالؒ) نام کی کتاب جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد مشتمل ہے ڈاکٹر شریعتی کی تقریر پر جو انہوں نے (۱۹۷۰ء میں) اقبالؒ کانفرنس میں کی تھی جو تہران میں "حسینیہ ارشاد" کے زیراہتمام منعقد ہوئی تھی دوسری جلد مشتمل ہے ان تصنیفات پر جو ان کی تصنیفات کے مرتبین نے ان کو اس کتاب میں "ماواقبالؒ" کے نام سے دے دیا ہے۔

یہ ترجمہ جو آپ کے پیش نظر ہے جلد اول اور دوسری جلد کے ایک حصہ کے خلاصہ کا ترجمہ ہے مع کچھ تصرفات کے جو علامہ اقبالؒ اور ان کی افکار کے پہلوؤں کے تعارف سے متعلق ہے۔ جلد دوم کا بیشتر حصہ جو اصل کتاب کے متن میں موجود ہے لیکن یہاں اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا اکثر عمرانیات کی رو سے دین اور اس وقت کے ایرانی معاشرہ کے تجزیہ سے متعلق ہے۔ لہذا وہ پاکستانی حضرات کے لئے چنداں قابل فہم اور قابل استفادہ نہیں ہے۔ اس تصرف شدہ خلاصہ میں بعض مضامین جو غالباً طولانی موضوعات اور معترضہ جملوں کے طور پر اصل کتاب کی عبارات کے درمیان میں آئے ہیں یا ایسی مثالوں اور شہادتوں کو جو خاص طور پر اردو زبان

قارئین کے لئے قابل فہم نہیں اور تاریخ، معاشرہ اور اصل کتاب کے متن میں آئے ہوئے ایرانی اور فارسی کنایات اور اشارات کو جو جوانوں یا نوجوانوں کے لئے نامانوس ہیں، حذف کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ حذف شدہ عبارات میں بعض نادر نکات یا مفید اشارات اہل سخن یا اہل درد محقق حضرات کے لئے موجود تھے لیکن اس ترجمہ کا اصل مقصد اقبالؒ کے ہم وطن دوست داروں کو اس زاویہ نظر سے روشناس کرانا ہے جو اقبالؒ کے مریدوں میں سے ایک کا ہے جو خود بھی اقبالؒ کا ہم وطن ہے لیکن یہ وطن جغرافیہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ وہی وطن ہے جو اقبالؒ کی نظر میں وطن ہے اور بڑی افسوسناک بات ہوتی اگر خلاصہ اور تصرف کے بغیر اقبالؒ کے جوان دوست داروں کے لئے اس کتاب سے استفادہ کا راستہ مسدود کر دیا جاتا۔

یہاں ضروری ہے کہ جناب جاوید اقبال قزلباش اور ڈاکٹر سید علی رضا نقوی کا جنہوں نے اس کتاب کے ترجمہ اور تصیح کی زحمت فرمائی شکریہ ادا کیا جائے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

ooo

پاکستان میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے ثقافتی قونصلر کے دفتر اور ثقافتی مراکز نے اپنے ایک فرض کے طور پر ہمیشہ اقبالؒ کی یاد، ان کی تصنیفات اور ان کی افکار کا اقبالؒ کی سرزمین میں احترام روا رکھا ہے اور ایران اور اقبالؒ کے پاکستانی دوستداروں کے تعاون سے اقبالؒ کے افکار کے احیاء اور اشاعت کے لئے مفید کوششیں انجام دی ہیں اور اب پاکستان اور ایران کے دو مسلمان ملکوں کے درمیان

ثقافتی معاہدہ کے انعقاد کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر یہ ترجمہ اقبال ؒ کے ارادتمندوں اور دوست داروں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ۔ البتہ ان دو خطوں کے درمیان قدرتی ثقافتی تعلقات کی تاریخ کئی ہزار سال پر محیط ہے ایران اور پاکستان کی دو قوموں کے درمیان عمیق اور گہری ثقافتی نزدیکی، مشابہت اور تبادلہ کی، دنیا کی سطح پر، کم تر مشابہت ملتی ہے ۔ اس موقع پر اس کتاب کی اشاعت اس مقصد سے ہے کہ ہم اپنے تمام مشترک امور کی تخلیص علامہ اقبالؒ کی شخصیت میں کر سکتے ہیں ۔ ہمارا تاریخی، لسانی، ثقافتی، دینی اور سب سے اہم دو قوموں کا قلبی اور نصب العینی اشتراک علامہ اقبالؒ کی عمیق اور بلند افکار میں عینی طور پر جلوہ گر ہوئے ہیں ۔ اقبالؒ ہمارا مشترک سرمایہ ہیں اور وہ الہام بخش راہ ہیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کے لائق شان وشکوہ عظمت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے ۔

علامہ اقبالؒ ہماری آج کی ضرورت ہیں اور ہمیں چاہیے آج بھی اقبالؒ اور ان کے تعارف کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں، نہ ایک دفتری اور سرکاری فرض کی انجام دہی کے طور پر، بلکہ ایک خدائی، انسانی اور ملی فرض کے طور پر ۔

علی ذوعلم
ثقافتی قونصلر و نمائندہ
اسلامی جمہوریۂ ایران در پاکستان

پہلا حصہ

ہم اور اقبال

جب ہم کسی ایسے بڑے انسان سے متعارف ہوں جس نے کامیاب زندگی گزاری ہو، تو اسکی روح کو اپنے جسم میں بسالیتے ہیں اور اس کے ساتھ جیتے ہیں اور یہ عمل ہمیں زندگی بخشتا ہے۔

(شاندل "سبز کتابچہ")

اس بہت قیمتی اور مفید پروگرام کے ذریعے، جو حسینیہ ارشاد کے تحقیقی اور تبلیغی ادارے کی کاوش سے یہاں منعقد ہو رہا ہے، شاید ہم پہلی بار اس جدید دور میں عالمی سطح پر بین الاقوامی اسلامی فکر اور بصیرت کے ساتھ ایک علمی اور تحقیقی کام کر رہے ہیں اور یہ بات خود اس احساس کی علامت ہے جس کا علامہ اقبالؒ ہمارے دور میں مظہر رہے ہیں۔

اسلامی معاشرہ اپنے اس جمود اور تعطل کے دور میں اپنے تنگ قومی اور بند مقامی شکلوں کے اندر منجمد ہو کر رہ گیا ہے اور اسلام کی عالمی بصیرت اور تصور کائنات فراموش ہو چکا ہے وہ وحدت جو اسلام نے آفاقی طرز فکر کی بنیاد پر قائم کی تھی

اور جو کسی بھی خاص قومیت اور سرزمین تک محدود نہیں تھی پارہ پارہ ہو گئی ہے اور بد قسمتی سے مسلمان ساری دنیا سے کٹ چکے ہیں اور روایات ، تاریخ اور گوناگوں جاہلیت کے عناصر سے مخلوط مذاہب اور غیر اسلامی افکار اور اسلام کے مسخ شدہ عقاید کے محدود دائرے میں محصور اور محبوس ہو کر رہ گئے ہیں لیکن آج اس قسم کے پروگرام اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے روشن فکر حضرات بجملہ ایران کے اس مرحلے تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ ان محدود دائروں کو جسے زمانے نے ان کے عظیم انسانی اور فکری وجود کے گرداگرد بنایا ہے توڑ دیں ، اور پھر یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ یہ پراگندہ اور منتشر جسم دوبارہ جڑ جائے اور وہ مکمل وحدت اور وہ " اسلامی کلیت " جس کی تمامیت کے علاوہ اسلام ہرگز زندہ صورت میں مجسم نہیں ہو سکتا دوبارہ تعمیر کر دی جائے ۔ یہ " تعمیر نو " بالکل وہی اصطلاح ہے جسے علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی عظیم تصنیف " اسلام میں مذہبی طرز فکر کی تعمیر نو " میں اپنا موضوع قرار دیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ ہماری اسلامی تحقیقات اور معنوی ، فکری ، علمی اور اسلام شناسی کی کوششوں کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا اور اس سے بھی زیادہ عمیق مکمل اور مفید پروگرام ہمارے سامنے آئیں گے ۔

خاص طور پر میری یہ آرزو ہے کہ سب سے پہلے اس شخصیت کے متعلق جس نے دنیا کے مسلمانوں کے نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی یعنی سید جمال الدین اسد آبادی کی یاد میں ایسا ہی پروگرام تیار کریں اور جلسہ منعقد کریں ۔ وہ شخصیت جس نے خوابیدہ مشرق میں بیداری کے لئے پہلی آواز بلند کی اور مشکوک خیالات اور آلودہ ہاتھوں والے جس کے سایہ تک سے ڈرتے ہیں یہاں تک کہ آج تک اسکی یادگار پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں ۔ کسی ہفتہ مل بیٹھیں اور اس شخص اور

اسکے اثرات پر بحث کریں اور اسے پہچانیں جس نے نہ صرف اسلامی اور ایرانی معاشرے بلکہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی دوسری اقوام اور بقول " فرانتز فانون " روئے زمین کے تمام مغضوب انسانوں کو متاثر کیا ہے میں نہیں چاہتا کہ صرف اسکی تعظیم و تجلیل کریں ۔ یقیناً سید جمال الدینؒ اور اقبالؒ جیسے انسانوں کو پہچانتا ایک فرد کی شخصیت کو پہچانتا نہیں ہے بلکہ ایک مکتب فکر اور ایک نظریہ اور ہمارے اپنے مخصوص حالات اور احوال کا پہچانتا ہے ۔ اقبال ایک " باب " کا عنوان ہے اقبالؒ یا سید جمال الدینؒ کو پہچاننے سے ہم ایک ایسے " متن " میں پہنچ جاتے ہیں جس کا عنوان یہ شخصیات ہیں اس کا " متن " خود ہم ، ہماری فکر ، ہماری مشکلات اور ہماری مشکلات کے حل کرنے کے طریقے ہیں ۔ اسی سے سید جمال الدینؒ اور اقبالؒ کی شناخت خود اسلام اور مسلمانوں کی شناخت اور ہمارے زمانہ حال و آئندہ کی پہچان ہے ۔

دور حاضر میں مسلمان کا تشخّص اور اسکی تکالیف اور استفسارات

میں ان ہزاروں افراد میں سے ایک فرد کے طور پر جو اس ملک اور وقت کے اس دورانیے میں کھڑے ، اپنی تقدیر ، اپنے مستقبل اور دنیا کے موجودہ حالات اور اپنی کیفیت پر غور کرتے ہیں اور ناچار کسی راہ حل اور نجات کی جستجو میں ہیں ۔ میں ایسے افراد کی زبان میں بات کرتا ہوں ۔ میں خود ان ہی میں سے ایک ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے جن میں میری طرح کا درد ہے عرض کروں کہ اقبالؒ ایک علامت ہے ہماری اس بنجر سرزمین اور ہمارے اس دور کے پرآشوب اور طوفانی صحرا میں جہاں ایک پیاسا پر تجسس مفکر جس مکتب اور مذہب کی طرف بھی رخ کرتا ہے اور جس راہ حل اور فکر اور عنصر کی طرف رجوع کرتا ہے سیراب نہیں ہوتا ہے ، اور

اگر راہ حل درست بھی ہو اور مطلوبہ نتائج تک بھی پہنچ جائے، تب بھی وہ اسکے تمام دردوں اور ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہوتا، اس لئے کہ میں ایک خاص مخلوق کے اعتبار سے اس موجودہ زمانے میں ایک نسل کے طور پر صرف اپنے ملک، اپنے معاشرے اور اپنی تاریخ کی حدود میں نہیں جی رہا ہوں۔

میں ایک طرف تو بیسویں صدی سے وابستہ ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں نہیں جی رہا۔ بیسویں صدی کے آلام، مشکلات، اور واقعات نے مجھے، میرے جذبات، میری تقدیر اور معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ صنعت، علم، جبر، ترقی، انقلاب اور وجود و عدم وجود جس کا نام مغربی تمدن رکھا گیا ہے ان کے گراں ڈیل دیو کے مقابل سینہ تانے کھڑا ہوں اور مجھے اس عظیم طوفان اور ان سب رنگارنگیوں اور اچھے برے مناظر کے سامنے جو سب مل جل گئے ہیں، اپنے مقام کا تعین کرنا ہے۔

دوسری طرف میں ایک انسان ہوں اور مجھے جاننا ہے کہ اس فطرت اور بڑی کائنات میں ایک انسانی وجود کی حیثیت سے میرا کیا کام ہے؟ مجھے کس طرح سے زندگی گذارنی چاہیے اور میری تقدیر اور داستان کیا رہی ہے اور میری فطرت کیا ہے؟ میں کس واسطے آیا ہوں، مجھے کس لئے جینا چاہیے اور خلقت، روح اور اس تدبیر کے، جو خلقت پر مسلط ہے، کیا معنی ہیں؟ میں کس چیز پر اعتقاد رکھوں اور زندگی، ہستی اور اپنے معاشرے اور زمانے کے اور خود اپنے بالمقابل میری فکر کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟

دوسری طرف میں زمین کے ایک ایسے خطے سے وابستہ ہوں جس کا نام مشرق ہے جس کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں فکر انگیز، وسوسہ انگیز، اور درد آور

ہیں۔

اسی طرح میں ایک ایسے معاشرے اور امت سے وابستہ ہوں، جو اسلامی کہلاتا ہے۔ میری فطرت و تقدیر وجذبات اور تربیت اس ملت سے منسلک ہیں، اور یہ امت ایک ایسی حالت میں ہے اور ایسے عوامل کے سبب تکلیف اٹھا رہی ہے کہ میں اس کے مقابل بری الزمہ نہیں رہ سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ اپنے احساس کو کس بنیاد پر استوار کروں اور کس فلسفے کی بنیاد پر دنیا کو دیکھوں اور کس چیز پر اعتقاد رکھوں؟

یہ تمام سوالات بغیر جواب کے رہ گئے ہیں۔

سائنس جو ان سوالوں کا جواب دینے کی مدعی ہے، وہ بھی آج، خصوصاً مشین زدگی صنعتی بورژوائیت اور تجارتی ثقافت کے بعد ایک بند گلی میں پہنچ گئی ہے اور موجودہ نسل اور یہاں تک کہ دانشوروں کا بھی اس پر ایمان متزلزل ہو گیا ہے۔

یہ ہیں میری پریشانیاں اس ہستی میں ایک انسانی وجود کی حیثیت سے اس دنیائے فطرت میں میں نہیں جانتا، میں کس چیز پر اعتقاد رکھوں اور کس چیز پر اعتقاد نہ رکھوں؟ مسئلہ کے حل کی راہ کونسی ہے؟ ہستی کی کلی حقیقت کیا ہے؟ فطرت کا کوئی نصب العین ہے یا نہیں؟

میری بیسویں صدی کے آلام

ایک طرف تمام پریشانیاں جو بیسویں صدی کے انسان کو اور متمدن بشر کو آج درپیش ہیں، مجھے بھی درپیش ہیں، اگرچہ میں ایک مشرقی انسان اس جدید تمدن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا اور اسکے فیوض سے مستفید نہیں ہو رہا، لیکن اس کے تمام انحرافات، مصیبتوں، امراض اور بدبختیوں سے مجھے بھی حصہ مل رہا ہے۔ یہاں تک کہ خود آج کے ایک متمدن یورپی فرد سے بھی زیادہ!

ابھی ہم ٹیکنالوجی کی حکومت تک بھی نہیں پہنچے ہیں، افسر شاہی دور میں بھی داخل نہیں ہو پائے، مشین زدگی اور سرمایہ داری کے دور تک بھی نہیں پہنچے۔ لیکن ان تمام پریشانیوں اور بیماریوں کو جو اس دور میں مغرب سے مخصوص ہیں، اپنے تمام تر وجود اور سارے حواس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ مشرقی ہونے کے منحوس نتائج اور المیے اور ان جدید نظاموں کے مقابلے میں میرے مادی اور معنوی حملوں کے شکار ہونے کے علاوہ ہیں۔ اس لئے کہ ان حالات میں، میں ایک مشرقی انسان، بیسویں صدی کی تمام پریشانیوں اور دکھوں کو جدید تمدن کے مادی اور روحانی مظاہر کے ہمراہ اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے ایک پسماندہ معاشرے کی تکالیف اور پریشانیاں مثلاً بھوک، جہل، بدبختی کو بھی محسوس کرنا چاہیے، یعنی میں دو ادوار کے درمیان کھڑا ہوں اور ان دونوں ادوار کے متناقض دکھوں کو اپنے وجود کے اندر پاتا ہوں۔

مجھے ایک غیر متمدن انسان کی طرح پسماندگی اور انحطاط اور مادی کمزوری، ثقافتی افلاس، جہالت اور ایک ایسے انسان کی طرح جو مشین، صنعت و طاقت اور سائنس کے دور سے وابستہ ہو فکری انتشار، تاریکی، روحانی بیماریوں، فلسفیانہ مایوسیوں، تنہائی اور بیسویں صدی اور جدید ترقی یافتہ تمدن کے سب انحطاطات، انحرافات اور بدعنوانیوں کا رنج بھی سہنا ہے۔

میں کیا کروں؟ کون ہے جو ان سوالوں کا جواب دے؟ وہ شخص جو آگاہ بھی ہو اور دردمند بھی اور ذمہ دار بھی ہو اور ساتھ ساتھ مسلمان اور مشرقی بھی ہو۔

باوجود اس کے کہ میں بے شک سید جمال الدینؒ کو تحریک اسلامی کے عظیم ترین بانیوں میں سے سمجھتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یقین ہے کہ سید جمال الدینؒ کی عظیم، تعمیری اور آغاز کنندہ تحریک اپنے ارتقاء کے راستے پر چلتی ہوئی علامہ اقبالؒ تک پہنچی ہے اور علامہ اقبالؒ نہ صرف اپنے افکار سے بلکہ اپنی شخصیت سے بھی

میرے ان تمام سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہ بات جو مجھے اپنی گفتگو کے آخر میں کہنی چاہیے تھی، میں اسے ابتدا ہی میں کہہ رہا ہوں۔

جب میں اقبالؒ کے متعلق سوچتا ہوں تو میں ایک علیؑ صفت شخص کو دیکھتا ہوں ایک ایسے انسان کو علیؑ کے طرز پر لیکن بیسویں صدی کے متناسب کمیتی و کیفیتی اندازوں اور بشری صلاحیتوں کے مطابق کیوں؟ اس لئے کہ علیؑ وہ ذات ہیں کہ نہ صرف اپنی فکر اور کلام بلکہ اپنے وجود اور زندگی سے تمام زمانوں میں بشر کے سارے دکھوں ضروریات اور ہر قسم کی احتیاجات کو رفع کرتے ہیں۔

پراگندہ اسلام اور منتشر علیؑ:

لیکن یہ علیؑ یہ اسلام، تمام تاریخ کے تسلسل میں مختلف عوامل کے اثر سے، جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، منتشر ہوگئے اسلام ختم نہیں ہوا، علیؑ بھی ختم نہیں ہوئے مکتب اسلام بھی موجود ہے۔ مگر جس چیز نے مکتب اسلام کی اس انقلابی طاقت اور حیاتی جوش و خروش کو اس سے چھین لیا ہے، وہ پیکر اسلامی کا بکھر جانا ہے، نہ کہ اس کا ختم ہو جانا!، تاریخ میں پہلی بار اسلام ایک ایسا مکتب تھا کہ جس نے مذہبی احساس اور مذہب کی معجزہ آسا طاقت کو، جو ہمیشہ فرد کے میلان بہ درون اور اس کی ذہنیت میں مجسم ہوتی اور تزکیۂ نفس اور عالی انسانوں کی تعمیر کرتی تھی "آسمان سے زمین پر لے آیا" ① اور اس عظیم اندرونی معنوی طاقت اور میلان بہ فرد کو ایک

۱۔ یہ سقراط کا فلسفہ کے متعلق قول ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے "میں فلسفے کو آسمان سے زمین پر اتار لایا ہوں" اسلام نے مذہب کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔

خارجی اور معاشرتی احترام بھی بخشا ہے اور جامعہ بشری کی تعمیر، نظری رہنمائی اور اس دنیا کی زندگی کی راہ میں انسانی معاشرہ کو استعمال کیا۔

رہبری یہ نہیں ہے کہ اخلاقی راہنمائی کو مسیح کے ہاتھ میں دے دیں اور سیاسی راہنمائی کو قیصر کے حوالے کر دیں۔

زندگی یہ نہیں کہ آخرت کی زندگی کو دین کی بنیاد اور دُنیوی زندگی کو تعقل کی بنیاد پر استوار کریں۔ اور انسان یہ نہیں کہ اس کے میلان بہ درون کو عشق اور ایمان اور اس کے میلان بہ بیرون کو مادیت اور سائنس سے تعمیر کریں، بغیر عالمی توجیہ اور بغیر جہان شناسی کی بنیاد (فراہم کئے)۔

اسلام نے اپنے انفرادی اور معاشرتی، مادی و معنوی مکتب کی بنیاد توحید پر رکھی ہے اور جیسے کہ میں نے کہا ہے، توحید صرف اپنے فلسفیانہ اور کلامی حصار میں، جیسے کہ تاریخ اور مفکروں اور علماء کے ذہنوں میں ہمیشہ موجود رہا ہے، محصور و محدود نہیں ہے۔ توحید، وحدت ذات خدا کے معنوں میں دنیاوی، مادی اور انسانی انعکاسات اور منطقی التزامات رکھتی ہے۔

توحید پر اعتقاد ایک ہی وقت میں وحدت انسانی اور اسی طرح انسان کی طبقاتی وحدت کی بنیاد، نیز ہستی میں ایک عام وحدت کی تعمیر کے معنوں میں ہے جس میں انسان فطرت کے راستے پر ارتقاء پیدا کرتا ہے۔

یہ ہیں توحید اسلامی کے معنیٰ اور یہ نہ صرف فلسفے اور مذہب کی بنیاد ہے، بلکہ فلسفے، تاریخ، عمرانیات اور علم حیات بشری کی بھی بنیاد ہے۔ (توحید کے چار پہلو: جہان شناسی، تاریخ، معاشرہ اور انسان ملاحظہ ہو: "اسلام شناسی کے دروس" (مطبوعہ ارشاد)

اس " توحیدی دین " میں علیؑ اور وہ تمام بزرگ شخصیات جنہوں نے خالصتاً اور براہ راست پیغمبر اسلام اور مکتب اسلام سے تربیت حاصل کی ہے، ایسی ہی ہیں۔

یہ شخصیات دو پہلو رکھتی ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو بالکل علیؑ کی طرح ، وہ مرد جو مختلف حالات اور اندرونی جذبات کے دوران ہستی سے فارغ ایک روح کی یاد دلاتا ہے اور اپنی معنوی معراجوں میں "آسمان کے راستوں کو زمین کے راستوں سے بہتر پہچانتا ہے "، ہیں۔

ایسی روح جس کو رات سے صبح تک نیند نہیں آتی اس خیال سے کہ " اسلامی معاشرے کے کسی دور افتادہ گوشے میں کوئی انسان بھوکا نہ سو گیا ہو " ۔ ایک ایسی روح ہے جو کہ معاشرے میں بھوک کے مسئلے ،یہاں تک کہ روئے زمین کے کسی حصہ پر ایک فرد کی بھوک کے سلسلے میں اتنا حساس ہے ، بالکل ایک عوام دوست مادی رہبر کی طرح ہے جو لوگوں کی مادی زندگی کی حقیقت و اصلیت کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔

اس کا دوسرا پہلو ایک ایسے حکیم کا ہے جس کو خلوت و سکوت اور باطن نے جلا ڈالا ہے کہ گویا وہ اس سارے عالم کے بارے میں نہیں سوچتا۔

یہ " جو صاحب شمشیر و سخن ، اہل عشق و تفکر ہے ایسا مرد ہے جس کی تلوار سے موت برستی ہے ۔ اور زبان سے وحی " ۔ یہ شخص ایک مثالی انسان کا ایک نمونہ ہے ۔ یہ عظیم اصحاب ، انسانی نمونے اور مثالیں ہیں ، جو پیغمبر (ص) اور ان کا مکتب تاریخ ، بشر ، انسان اور امت اسلامی کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود کو اس

طرح سے تعمیر کریں ۔ یعنی " کامل انسان " اس قسم کے انسانوں کے نمونے ہیں جنہیں " عمرانیات " (کی اصطلاح) میں (انسان کامل) (L.Homme Total) کہتے ہیں ، یعنی وہ انسان جو وہ تمام مکمل پہلو رکھتا ہے جو مثالی انسان میں ہوتے ہیں

امام کے ایک معنی یہ ہیں : عالی مثال اور انسان نمونہ ۔

علیؑ کی یہ شخصیت اور یہ اسلامی مکتب باقی رہ گیا لیکن منتشر حالت میں بالکل ایسے ہی جیسے میں تو رہ جاؤں ، مگر میرا ہاتھ ایک جگہ سے کاٹا جائے ، اور پاؤں دوسری جگہ سے ، اور میرے سر اور آنکھ کو کہیں اور سے ، اور دل کو کہیں سے اور دماغ کو کہیں اور سے میں کامل طور سے تو موجود ہوں ختم نہیں ہوا ہوں ۔یہاں تک کہ میری تعظیم و تقدیس کی جاتی ہے اور ممکن ہے مبالغہ آمیز حد تک بھی ایسا ہو لیکن مجھ میں زندگی اور حرکت تو نہیں ہو سکتی ۔ (ان معنی میں) میں زندہ نہیں ہوں !

علیؑ کے اس عرفانی پہلو نے ایک نہایت شفاف بلند اور گہرے تصوف اور تاریخ اسلام میں بہت پختہ اور لطیف انسانی عرفان کے طور پر ترقی کی ہے ۔①

علیؑ کے ایک ہیرو ہونے کے پہلو نے معاشرے کے ایک اور طبقے میں علیحدہ طور پر جوانمردی ، بہادری اور پہلوانی کے تجسّم ، تجلّی اور مثال و علامت کی حیثیت سے عرفانی پہلو سے تعلق کے بغیر ترقی کی ہے ۔

ان کی حکمت و علم قرآن شناسی کے پہلو نے تفسیر ، اسلام شناسی ، حدیث شناسی کے ذریعہ اور سر چشمہ کی حیثیت سے اسلامی علوم کی بنیاد کے طور پر ترقی کی ہے

---

۱ ۔ مجھے ان غلط فائدوں سے جوان سے لئے جاتے ، سروکار نہیں ۔ ہر مکتب میں غلط فائدے اٹھائے جاتے ہیں ۔

ان کی فکر کے پہلو نے تفکر و علم کے مظہر کے عنوان سے ترقی کی ہے۔ ان کے سیاسی پہلو نے انصاف پسندی حق جوئی اور حتیٰ کہ تاریخ میں ستم رسیدہ عوام کی نگاہوں میں خدائے عدل و حق اور سرحد الوہیت تک ترقی کر لی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ باقی رہ گئے ہیں مگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔ اسلام رہ گیا ہے مگر جزو جزو ہو کر۔ یہی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا وجود ہے اور مکتب اسلام کی تربیت یافتہ منتخب اور برجستہ شخصیات ہماری ثقافت اور ہماری شناخت میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہر ایک ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہیں اور ان کے ٹکڑوں میں سے ہر ایک کی دوسرے ٹکڑوں سے جدا اصلی حیثیت حاصل ہو کر تعظیم کی جاتی ہے۔

عمارت کی تجدید

عمارت کی تجدید کے معنی یہ ہیں کہ ہم واپس جائیں اور جستجو کریں ہماری اپنی ثقافت اور ان تمام معانی اور علوم میں جو موجود ہیں اور تمام اسناد، تاریخ، تذکرہ اور اس فکر اور ان شخصیات کی شناخت کے عوامل اور عناصر میں تلاش کریں اور بنیادی عناصر کو ڈھونڈیں اور اصیل و خالص انسان نمونہ کے پہلوؤں کو، جو تربیت شدہ شخصیات کے اندر حقیقی اور مطلق صورت میں نہ کہ مثال اور قدیم قصوں اور افسانوی کرداروں کی طرح موجود ہیں پہچان لیں اور ان شخصیتوں اور اس عظیم مکتب کی تعمیر نو کریں یعنی ایک بار پھر مثالی انسان بنائیں اور اس ادھ بکھری کتاب کی، جس کا ہر باب اور ہر ورق کسی کے ہاتھ میں ہے شیرازہ بندی کریں اور از سر نو پہلے

کی طرح تدوین کریں کیونکہ ایک فکر، ایک صحیح روح ایک سالم پیکر اور ایک واقعی کامل وجود کے اندر ہوتی ہیں، لیکن اگر ہم عناصر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیں ایسے کہ ان کی اصل غائب ہو جائے اور کتنا بھی ان عناصر اور ایک دوسرے سے جدا شدہ اعضاء کی تعظیم کریں اور کتنا بھی ان جدا شدہ بدنوں کو ترقی اور ارتقاء کی منزلیں طے کرائیں، بالآخر ان کی وہ روح تو ختم اور وہ ان کی شخصیت فنا ہو چکی ہے اس جسم کی پوری طرح تعمیر نو سے روح پیدا ہوتی ہے۔

یہ روح کب اپنی اول صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ صورت جس نے ایک چوتھائی صدی کے اندر انسان کو بربریت اور وحشی پن سے نکال کر تمدن ساز انسان، دنیا میں نئی تاریخ کو بنانے والا اور تاریخ کے دھارے کو بدل دینے والا جس نے جبرِ تاریخ جو شروع ہو چکا تھا بدل کر رکھ دیا اور اس کو بنا دیا، یہ مکتب کب دوبارہ ایک نیم وحشی اور غیر تعلیم یافتہ عرب جندب بن جنادہ کو، جو نہ صرف دنیا کی کوئی خبر نہیں رکھتا، بلکہ اپنے ملک تک کی بھی خبر نہیں رکھتا، ابوزر غفاریؓ کی صورت میں ڈھال سکتا ہے؟ وہ مرد جو آج بھی انسان کی سعادت کی تحریک کے لئے ایک زندہ اور الہام بخش شخصیت ہے اور محروم لٹے ہوئے بدحال عوام کے لئے ایک امید کی کرن ہے؟

جس وقت اس بدن اور قرون وسطی کی تمام سیاہ تاریخ میں اس پارہ پارہ شدہ جسم کی دوبارہ شیرازہ بندی اور تجدید کریں، تاکہ یہ روح اپنے اس مکمل اور صحیح بدن میں لوٹ آئے اور ایک بار پھر یہ موجودہ مخدرہ مادہ اس روح القدس میں تبدیل ہو جائے جو صور اسرافیل کی طرح بیسویں صدی میں مردہ معاشروں میں پھونک دی

جائے اور ان سب حرکات کو دوبارہ پیدا کر دے اور دنیا میں وہ سب طاقت روح اور معنیٰ کو وجود میں لے آئے ۔ مثالی مسلمان انسان کی شخصیت کی یہ تجدید حیات ، بنیاد کی تعمیر نو اور بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے دور بنیادی عناصر کی شیرازہ بندی اور جمع آوری بیسویں صدی میں ایک نئے بدن میں جلوہ گر ہوتی ہے ، یہ نئی تعمیر شدہ الٹی ہوئی شخصیت محمد اقبالؒ کی ہے ۔

علامہ محمد اقبالؒ ایک مسلمان عارف نہیں ہیں جو غزالی کی طرح یا محی الدین عربی کی مانند اور حتیٰ (مولانا جلال الدین رومی) مولوی کی طرح جو صرف اور صرف ان ماورائی عرفانی حالات میں غور فکر کرے اور اپنے اس انفرادی ارتقاء ، تزکیہ نفس اور اپنے روشن ضمیر میں ، اور اپنی طرح کے چند دیگر افراد سے بنائے رکھے اور باہر سے غافل رہے اور مغلوں کے حملے ، حکومت کے جبر واستبداد اور لوگوں کے غلام بنائے جانے سے آگاہ نہ ہو ۔ نہ ابو مسلم اور حسن صباح اور صلاح الدین ایوبی اور ان کی مانند شخصیات کی طرح ہیں کہ تاریخ اسلام میں صرف مرد شمشیر و طاقت و جنگ و مبارزہ ہو اور فکر کی اصلاح اور تغیر و انقلاب اور معاشرتی روابط اور انسانی طاقت اور زور کے استعمال اور دشمن پر تسلط کو کافی سمجھے اور نہ ان سرسید احمد خان ہندوستانی کی طرح کے علماء کی مانند ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ اسلامی معاشرے اور قرآنی آیات خواہ کسی حال میں بھی ہو (اگرچہ انگریزوائسرائے کے زیر تسلط ہو) ایک آج کل کی عالمانہ تفسیر اور اسلامی عقائد کی بیسویں صدی کی سائنسی اور منطقی تاویلات سے اور گہری عالمانہ تحقیقات اور فلسفیانہ غور خوض کے ذریعہ اسلام کو زندہ کیا جاسکتا ہے ۔

اقبالؒ ایسے انسان ہیں جو بیک وقت نہ تو مغرب کی طرح سائنس کو انسانی ارتقاء اور اس کے دکھوں کے مداوا کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے فلسفی کی طرح ہیں کہ جو اقتصاد اور اقتصادی ضروریات کے حصول کو انسان کی تمام ضروریات کا حصول بتاتے ہوں اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں یعنی ہندوستان کے بڑے مفکروں اور بودھ مذہب والوں کی طرح ہیں کہ باطن کے صفا اور اس " سامسارائی " زندگی اور اس چکر سے روح کو نجات دے کر نیروانا کو انسان کے مشن کا انجام سمجھتے ہوں اور یہ خیال کریں کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں بھوک، غلامی، کمزوری اور ذلت ہو، وہاں پاک اور بلند مرتبہ روحیں اور تربیت شدہ اور سعادت مند انسان حتیٰ کہ تزکیہ شدہ اخلاق بنائے جا سکتے ہیں۔

نہیں، اقبال اپنے مکتب اور بنیادی طور پر اپنی ہستی سے یہ دکھاتے ہیں کہ جس فکر سے وہ وابستہ ہے، یعنی اسلام، وہ ایک ایسی فکر ہے کہ ایک طرف وہ دنیا اور انسان کی مادی ضروریات کی طرف پوری توجہ دیتا ہے پھر انسانوں کو ایسا دل بخش دیتا ہے کہ بقول انہی کی:

" زندگی کے خوبصورت ترین حالات کو اوقات سحرگاہی کے ذوق اور غور وفکر میں دیکھتا ہے "

وہ قطعی طور پر ایک عارف ہیں جو شفاف اور مادہ سے مبرّا روح کے مالک ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے انسان ہیں جو ہمارے زمانے میں تکنیک اور انسانی تعقل کی ترقی کو تعظیم واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ ایسے اشراقی اور جذباتی نہیں ہیں کہ " تصوف اور مسیحیت " اور

" لائٹز" اور " بودھ اور جین " کے مذاہب کی طرح سائنس کی تحقیر کرے یا عقل اور سائنسی ترقی کی تذلیل کرے ۔ چنانچہ وہ خشک سائنس کا بھی قائل نہیں کہ " فرانسس بیکن " اور " کلاڈبرنارڈ" کی طرح صرف مظاہر کے روابط اور مادی ظواہر کے پتہ چلانے اور قدرتی طاقتوں کو مادی زندگی کے خدمت گزار بنانے کے حصار میں رہے اور بیک وقت وہ ایسا مفکر بھی نہیں ہے کہ فلسفے ، اشراق ، سائنس ، دین ، عقل اور وحی کو باہم جمع کرتا اور جوڑتا ہو جیسے داراشکوہ اور بعض دوسروں نے بہت غیر مناسب طرح سے اس کام کو انجام دیا ۔ بلکہ وہ دنیا کے متعلق اپنی نگاہ اور بصیرت میں تعقل کو اور سائنس کو انہی معنوں میں جن میں آج کی دنیا میں وہ مروج ہیں ، نہ اسی ہدف کے ساتھ عشق ، جذبہ اور الہام کا ہم کار ، ہمراہ اور ہم قدم سمجھتا ہے اور نہ انسانی روح کے ارتقاء کی راہ میں ان دونوں کو باہم مل کر کام کرنے والا سمجھتا ہے ۔

علامہ اقبالؒ کا انسانیت کے لئے عظیم ترین اعلان یہ ہے کہ " عیسیٰ (ع) کی مانند دل رکھئے ، سقراط کی طرح فکر اور قیصر کے مانند ہاتھ ۔ مگر ایک واحد انسان ، ایک بشری وجود کے اندر ، ایک روح کی بنیاد پر ، اور نصب العین تک پہنچنے کے لئے یعنی اقبالؒ خود ، وہ انسان جو زمانے کی سیاسی بیداری کو اپنے عروج پر رکھتے تھے ، (اس طرح کہ بعض لوگ انہیں فقط ایک سیاسی شخصیت اور قومی آزادی کے رہبر اور بیسویں صدی میں استعمار کا مخالف سمجھتے ہیں) ، اور فلسفیانہ اور سائنسی تفکر میں وہ اس سطح پر پہنچے ہوئے تھے کہ آج مغرب میں انہیں " برگسان " کے درجہ کا ایک ہم عصر مفکر اور فلسفی اور تاریخ اسلام میں " غزالی " کی صف میں سمجھتے ہیں ، ساتھ ساتھ وہ ایسی شخصیت ہیں جن کو ہم اسلامی معاشرے کا ایک مصلح جانتے اور کہتے ہیں ،

کیونکہ وہ اپنے انسانی اور اسلامی معاشرے، ایک ایسے معاشرے کے بارے میں جس میں وہ خود رہتے ہیں، اور اس کی بیداری، نجات اور آزادی کے لیے جہاد کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف تفنن اور سائنس اور بقول سارتر" بائیں ہاتھ والوں کے روشن فکرانہ تظاہرات کی سیاسی شکلوں میں بلکہ ایک پابند اور سپردہ شدہ آدمی کی صورت میں نگاہ کرتے اور کام کرتے اور جستجو کرتے ہیں، اور بیک وقت مولوی (مولانا جلال الدین رومی) کے بھی عاشق ہیں اور ان کے روحانی معراجوں میں ان کے ہم سفر اور ان کی عاشقانہ آگ، روحانی درد اور اضطراب سے جلے ہوئے اور پگھلے ہوئے ہیں۔

وہ ایسے عظیم انسان ہیں جو یک سوئی نہیں ہیں، پارہ پارہ نہیں ہوئے، وہ ایسے مسلمان ہیں جو ایک طرح کے اور ایک جانبہ نہیں ہیں، یعنی وہ کامل مسلمان ہیں۔ اگر وہ مولانا روم سے عشق بھی کرتے ہیں تو کسی وقت بھی مولانا کی ذات میں گم نہیں ہو جاتے اور ایک پہلو کی طرف جھک نہیں جاتے۔

اقبالؒ یورپ گئے اور یورپ میں ایک فلسفی کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ انہوں نے یورپ کے فلسفی مکاتب کو پہچانا اور پہنچوایا اور سب نے تسلیم کیا کہ وہ بیسویں صدی کے فلسفی ہیں، لیکن انہوں نے مغرب کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا

انہوں نے مغرب کو تسخیر کیا اور انہوں نے بیسویں صدی اور مغربی تمدن میں ایک تنقیدی فکر اور قوت انتخاب کے ساتھ زندگی گزاری۔ مولانا روم کے ساتھ بھی، جن کے وہ عاشق اور مرید ہیں۔ وہ اسی مقام تک ہیں جہاں تک کہ وہ روح اسلامی کے دیگر اصلی پہلوؤں کے مخالف نہیں ہیں۔

وہ تصوف کے متعلق کہتے ہیں:

" چو قسمت ازلی بی حضور ما کردند
گراندکی نہ بوفق رضا است خردہ مگیر"

(چونکہ ازلی تقسیم ہماری غیر حاضری میں کی گئی اگر (ہمارے کام) کچھ (رضائے الہی) کے موافق نہیں ہیں تو ان پر اعتراض نہ کرو)۔

یا

"زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز"

(اگر زمانہ تمہارے لئے سازگار نہ ہو تو تم زمانے کے مطابق خود کو ڈھال لو)

لیکن صوفی اقبالؒ کہتے ہیں:

"زمانہ باتو نسازد، تو بازمانہ ستیز"

(اگر زمانہ تمہارے لئے سازگار نہیں، تو تم اس سے جنگ کرو)۔

زمانہ یعنی انسان کی سر گذشت اور تقدیر، انسان کی زندگی اور انسان خود ایک "موج" ہے، ایک افتادہ (پڑا ہوا) ساحل نہیں، اس کا وجود، اور ہستی حرکت کرنے میں ہے، میں کیا کہتا ہوں؟ "حرکت کرنے میں ہے"۔

انسان کو اقبالؒ کے عرفان کے مطابق، جو نہ تو ہندی تصوف ہے اور نہ مذہبی جنون، بلکہ قرآنی عرفان ہے، زمانے کو بدل دینا چاہیے۔ قرآن کے اسلام نے "آسمانی تقدیر" کی جگہ، جس میں انسان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے، "انسانی تقدیر" کو دے دی ہے، جس میں انسان کا بنیادی کردار ہے۔

یہ عظیم ترین "انقلابی اصول" ہے جو بیک وقت مشرقی اور تعمیری اصول ہے کہ جسے اسلام نے انسان کی مذہبی جہان بینی، فلسفۂ حیات اور انسان شناسی میں

بنایا ہے۔

اس لئے فلسفہ مرکزیت انسان اور بیسویں صدی کے جدید آزاد خیال مفکروں نے مذہب پر جو سب سے بڑی تنقید کی ہے، اور کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ مذہبی عقیدہ جو "قاہریت"، مطلق آسمانی ارادے، یعنی مشیت الہی، اور زمین (والوں) کی مطلق مقہوریت، یعنی انسانی خواہش کی مقہوریت پر استوار ہے، انسان کو منطقی طور پر غیبی قوتوں کے ہاتھ کا ایک ناتواں اور بے ارادہ کھلونا دکھاتا ہے۔ اور یہ بذات خود ذلت اور غلامی کا موجب ہے اور طاقت اور آزادی کے سلب ہونے کا سبب اور ذمہ داری کی نفی کا نتیجہ اور اس کے نتیجے میں "موجودہ حالت" کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور جو کچھ کہ سر پر آئے اس پر راضی رہنا اور دنیا میں ہر اس سرنوشت کو جو آدمی کے اوپر لاد دیا جائے قبول کرنا اور عدم مقصدیت اور بے کاری (یہاں تک کہ بے جا مداخلت اور نافرمانی کا اعتراف کرنا اور ہر قسم کی تنقید کی کوشش کے لئے اور انسان کی خواہش کو حالت کی تبدیلی اس کی جگہ لانے کے لئے جو پہلے سے یقینی طور پر اس کا مقدر ہو چکی ہے اور چونکہ جو کچھ بھی ہے اور ماضی میں رہا ہے اور آئندہ ہو گا۔ وہ آسمانی تقدیر ہے، اس کی تغیر و تبدیلی اور اصلاح کے لئے انسان کی تدبیر ناممکن بھی ہے اور نامعقول اور خلاف شریعت بھی۔

لیکن اسلام کا فلسفہ، اس کے باوجود کہ خدائے واحد اپنی مطلق سلطنت اور ملکوتی جبروت پر مسند نشین ہے اور "خلق وامر" یعنی تخلیق کا کام اور ہدایت اور تدبیر اور دنیا پر حکومت کا کام بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ "لہ الخلق ولہ الامر" (الاعراف آیہ ۵۴) (خلق اور امر اسی کا کام ہے) اس کے باوجود اس نے دنیا کی اس عظیم سلطنت

میں انسان کی اس طرح منصوبہ بندی کی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خداوند متعال کے قانون کے حدود اور اس کی حاکمیت کے تسلط سے خارج نہیں ہو سکتا آزادانہ زندگی گزارتا ہے اور خداوند متعال انسانوں کے لئے اعلان کرتا ہے "ہم نے آپ کو محترم جانا اور خشکی سمندر اور زمین وآسمان کو آپکے اختیار میں دے دیا اپنی اس روح کو جو ، ارادہ ، قوت ایجاد و انتخاب و رہبری و تدبیر ، خود آگاہی اور مافوق فطرت صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کے متعلق تفکر سے عبارت ہے ۔ آپ کے اندر پھونک دیا ، تاکہ ہم جان لیں کہ آپ میں سے کون زیادہ نیک کردار رکھتا ہے " اسلام کا انسان ارادہ ، نافرمانی اور فرمانبرداری کا اختیار رکھتا ہے ۔ اسی بنا پر وہ اپنی تقدیر کا خود بنانے والا ہے ۔ "کل نفس بما کسبت رهینته " (المدثر آیہ ۳۸) (ہر نفس جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے اس کا مرہون ہے) یعنی ہر فرد بشر اپنے اعمال کا گروی ہے اور انسان کے لئے ماسوا اس کے جو کچھ اپنی کوشش ، حرکت اور جستجو سے حاصل کرتا ہے اور کچھ نہیں ہے "لیس الا انسان الا ماسعی " (النجم آیہ ۳۹)

اقبالؒ نے قرآن میں اپنی عرفانی سفر کے دوران اس اصول ، یعنی انسان میں عمل اور ذمہ داری کے اصول کو پالیا ہے ، یعنی جس چیز سے "فلسفہ مرکزیت انسانی " " وجودیت " اور " انتہا پسندی " کے پیرو کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کی نفی اور خدا سے انکار کے ذریعہ اس تک انسان کو پہنچا دیں ۔ اس لئے یہ لوگ درحقیقت مذہب اور مذاہب میں رائج خدا کے تصور کو آزادی ، عزت ، اصولوں پر عمل اور انسانی ذمہ داری کا مخالف سمجھتے تھے ، جبکہ اسلام بالکل واضح طور پر اور بغیر فلسفیانہ توجیہات اور تاویلات کے اعلان کرتا ہے کہ انسان کی آخری سرنوشت اس دن میں

مضمر ہے جب انسان وہ سب دیکھے گا جو کچھ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے ذریعے پہلے سے کما چکا اور بھیج چکا ہو گا۔

"یوم ینظر المرء ماقدمت یداہ" (النباء آیہ ۲۵)

اقبالؒ نے اس زمانے کی تمام فلسفیانہ اور روحانی منزلوں کو اپنی بصیرت، ایمان اور عرفان اسلامی کی سمت یابی کے ذریعے طے کیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک " مہاجر مسلمان ہے جو ہندوستان کے پراسرار اوقیانوس سے اٹھا اور یورپ کے پر اقتدار بلند ترین کوہستان کی چوٹیوں کے اوپر پہنچ گیا، لیکن وہاں رہا نہیں، ہمارے درمیان لوٹ آیا، تاکہ اپنے حیرت انگیز سفر سے لائے ہوئے تحفے کو اپنی ملت یعنی ہمیں عطا کر دے اور میں اس کی شخصیت میں دیکھتا ہوں کہ ایک بار پھر اس نے اپنی پریشان، خود آگاہ اور درد مند نسل کے لئے بیسویں صدی میں اسلام کی " نمونہ سازی " کی ہے۔

اقبالؒ نے ایک نرم کرنے والی اور الہام سے بھری مشرقی روح کو اشراق اور دل کی ثقافت کی سرزمین سے چن لیا، غرب کے عظیم تفکر کو جو تمدن، عقل اور علم کی سرزمین ہے، خلاقیت اور ترقی کی تمام تر قوت کے ساتھ اس کے دماغ میں رکھ دیا اور اس قسم کے سرمائے کے ساتھ بیسویں صدی کو پہچان لیا ہے۔

وہ ان قدامت پرستوں اور رجعت پرستوں میں سے نہیں ہیں کہ بغیر پہچانے ہر شے سے جو جدید ہو اور جدید تمدن اور مغرب سے ہو، بلا سبب دشمنی کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ان کی مانند بھی نہیں کہ جو بغیر تنقید و انتخاب کی جرأت رکھتے ہوئے مغرب میں کھو جاتے اور اس کے مقلد بن جاتے ہیں۔اقبالؒ ایک طرف سائنس سے

خدمت لیتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی تمام معنوی ضرورتوں اور ارتقائی تقاضوں کے سلسلے میں سائنس کو ناکافی اور ناقص سمجھتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لئے ان کے پاس راستہ موجود ہے بہر حال اقبال ایک ایسے شخص ہیں جن کے پاس دنیا کا ادراک ہے اور اس عالم شناسی اور فلسفیانہ روحانی تفسیر جو وہ جہان اور انسان کے بارے میں دیتے ہیں، کی بنیاد پر انہوں نے اپنے معاشرتی مکتب کی بنیاد رکھی ہے اور جس ثقافت اور تاریخ سے وہ وابستہ ہیں اس کی بنیاد پر، جہاں تک کہ ہماری بیسویں صدی کی انسانی عمارت کے مصالحے میں صلاحیت ہے۔اسے اسی طرح جیسے کہ وہ خود معیار قرار دیتے ہیں۔ علیؑ کی فکر پر تعمیر کیا ہے۔

علیؑ کی کونسی فکر؟ یعنی کس طرح سے؟ یعنی مشرقی دل اور مغربی دماغ رکھنے والا انسان وہ آدمی جو درست اور گہری سوچ بھی رکھتا ہے اور خوبصورت اور پر شکوہ انداز میں عشق بھی کرتا ہے۔وہ شخص جو روح کے دردوں سے بھی آشنا ہے اور زندگی کے رنجوں سے بھی باخبر ہے وہ شخص جو خدا کو بھی پہچانتا ہے اور خلق کو بھی جانتا ہے وہ پاک باز و پارسا جو نور معرفت کی روشنی اور آتش عشق و ایمان کی سوزش رکھتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی دربستہ ملتوں کی تقدیر کے بارے میں اس کی تیز بین آنکھ کے سامنے غفلت و جہالت کا سیاہ پردہ نہیں پڑجاتا اور اس نے اصلاح اور انقلاب وفکری تغیر کی بنیاد رکھی ہے، اور اسی طرح سے ایک مفکر کی حیثیت سے اس نے سمجھ لیا ہے کہ سائنس کی خشک آنکھ (جیسے کہ فرانسس بیکن کہتا تھا) ایسی آنکھ نہیں ہے کہ دنیا میں تمام حقیقت کو پالے۔اسی طرح اسے یہ احساس ہے کہ ایک عاشق کا شیدا دل صرف ریاضت اور تصفیہ باطن و تزکیہ نفس سے کسی منزل پر بھی نہیں

پہنچتا۔اسی لئے کہ انسان معاشرے اور زندگی و مادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور تنہا خود کو نکال کر نہیں لے جا سکتا۔فرد معاشرے کے کارواں کے ہمراہ حرکت میں ہے اور اپنی راہ کو اس سے جدا منتخب نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہم سب کی آرزو ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا مکتب ہو کہ ہماری فلسفیانہ ضرورت کو بھی پورا کر دے (اس دنیا میں جہاں مکاتب بھی اور فلسفے بھی آج کے انسان اور آج کی فکر کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے) اور ایک ایسا مفکر انسان بنائے جو آج کی دنیا کو اور نئی دنیا کے تمدن اور ثقافت کو بھی پہچانے اور خود ہم سے اور ہماری ثقافت کے غنی سرمایوں سے بھی ناآشنا و بیگانہ نہ ہو ایسا انسان جو ہماری ثقافت اور تمام معنوی و مذہبی سرمایوں سے نزدیک سے اور صحیح طور پر آشنا ہو، مگر زمانے سے بیگانہ نہ ہو اور چوتھی اور پانچویں صدی میں زندگی نہ گزارتا ہو، اسی طرح وہ انسان جو سوچ سکتا ہو اور دقیق سائنسی فکر رکھتا ہو اور اپنی امت کے رنج اور زندگی، غلامی اور سختی سے غافل نہ رہے اور ایسا انسان جو پھر اگر مطلق انسانی رنجوں اور مادی تکلیفوں کی طرف رخ کرتا ہو اور موجودہ انسانی معاشرے یا اپنے معاشرے کے انتشار اور بدبختیوں پر غور کرتا ہو تو پھر بھی انسانی مثالی تصور اور انسان کے جامع مفہوم اور تاریخ میں انسان کے ابدی فریضہ منصبی سے غافل نہ رہے اور انسان کو اور تمام انسانی مثالی تصورات کو مادی مصرف کے مرحلہ میں نیچے نہ لائے۔

ان سب چیزوں کو، جنہیں ہم گوناگوں میدانوں میں چاہتے تھے، ہم اقبالؒ میں دیکھ سکتے ہیں۔اسی لئے کہ تنہا کام جو اقبالؒ نے کیا ہے، اور یہ ایک مسلمان

ہونے کے ناطے بیسویں صدی کے مسلمان معاشرے میں اقبالؒ کی سب سے بڑی کامیابی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان تمام شناختوں کی بنیاد پر جو جدید اور قدیم ثقافت کی برکت سے وہ رکھتے ہیں، خود کو اس نمونے پر جو ان کے اعتقادی مذہب، یعنی اسلام نے دیا ہے، تعمیر کر سکیں یہ بیسویں صدی اور ہمارے معاشرے میں اقبالؒ کی سب سے بڑی کامیابی اور سب سے بڑی عظمت ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شخصیت کامل ہے۔ ہرگز نہیں میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ شخصیت علامت ہے، نہیں۔ وہ ایسی شخصیت ہے کہ جو ایک کامل مسلمان اور کامل اسلامی شخصیت کے بکھر جانے کے بعد بیسویں صدی میں دوبارہ تعمیر ہوئی ہے۔ یہ دوبارہ تعمیر ہونا ایک کام کا آغاز ہے کہ ہمیں روشن خیال مسلمانوں کی حیثیت سے چاہیے کہ اس کام کو انجام دیں اور اپنی عمارت اور اسی طرح اپنے معاشرے کی عمارت میں عظیم ترین ذمہ داری کا احساس کریں۔ سب سے پہلے سید جمال الدینؒ تھے جنہوں نے اس بڑے سوئے ہوئے اور کئی صدیوں کے عظیم انسان (یعنی مسلمان) کو آگاہ کیا کہ تو کیسا ہے اور کیسا رہا ہے، اور اقبالؒ اس تحریک کے آغاز کے بعد پہلی مرتبہ پہلا پھل تھا اس بیج کا جسے سید جمال الدینؒ نے اس بنجر شدہ امت (کی زمین) میں بکھیرا اور یہ پہلا پھل، ایک بڑا نمونہ، اور عظیم قابل تقلید مثال اور " ہمارے " لئے بہت ہی ولولہ انگیز ہے۔ "ہم" جو مشرقی ہونے کی حیثیت سے اور اس نقطہ زمین سے وابستہ ہونے کے حوالے سے اور اس تاریخ سے وابستگی کے ناطے اور بحیثیت ایک انسان فطرت کے روبرو اور ایک انسان کی حیثیت سے مغرب کے سامنے (کھڑے ہیں)۔

مگر یہ کہ اقبالؒ ایک مصلح ہیں اس کے کیا معنی ہیں؟آیا اصلاح معاشرے کو تمام انتشارات، درروں اور بدبختیوں سے واقعی نجات دے سکتی ہے؟ یا ایک شدید، ناگہانی اور گہری جڑوں والا انقلاب بپا ہونا چاہیے سوچ میں بھی اور معاشرتی تعلقات میں بھی؟

جب ہم کہتے ہیں اقبالؒ ایک مصلح کی حیثیت سے، تو وہ خواتین و حضرات جو تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان رائج اصطلاحات سے آشنا ہیں، سوچتے ہیں کہ اس صفت کو ہم سیاسی عمرانیات کی مروجہ اصطلاح کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جس کے معنی اصلاح یا ریفارم ① کے ہیں، لفظ "انقلاب" ② کے مقابلے میں۔ عام طور پر جب ہم کہتے ہیں "اصلاح" تو اس کے معنی ہوتے ہیں تدریجی تبدیلی یا بالائی تعمیر اور جب ہم کہتے ہیں "انقلاب" تو اس کے معنی ایک ناگہانی تغیر یا زیر سازی، تمام چیزوں کا ٹوٹ پھوٹ جانا یا تمام چیزوں کی از سر نو بنیاد رکھی جانی۔ لیکن جب ہم اس تعبیر میں یہ کہتے ہیں کہ اقبالؒ ایک مصلح ہیں تو ہماری توجہ معاشرے میں اس تدریجی تبدیلی کی طرف نہیں ہوتی اور مقصود بتدریج تبدیلی یا ظاہری اصلاح نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کو اس کے لغوی معنی میں جس میں انقلاب بھی شامل ہے، استعمال کرتے ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبالؒ "مصلح" ہیں یا یہ کہ سید جمال الدینؒ کے بعد کے بڑے مفکر دنیا میں اس صدی کے "مصلحین" کے طور پر پیش کئے گئے ہیں،

۱- Reform

2- Revolution

تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ معاشرے میں تدریجی ارتقاء اور ظاہری اصلاح کے حامی تھے ۔ نہیں ، بلکہ ایک معنی میں وہ عمیق اور گہری جڑوں والے انقلاب کے حامی تھے ، سوچنے میں ، دیکھنے میں ، اور احساس کرنے میں انقلاب ، نظریاتی اور ثقافتی انقلاب!

اقبالؒ ، سید جمال الدین ، کواکبی ، اور محمد عبدہ بن ابراہیم اور انجمن علمائے مغرب کے ممبران وہ عظیم شخصیات ہیں جنہوں نے اس آخری سو سال میں مشرق کو ہلا کر رکھ دیا ۔ ان کی اصلاح کی ساری بنیاد اور بہتر تعبیر کے طور پر ان کا " اصلاحی انقلاب " اس اصول کے اعتراف اور اقرار پر استوار ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اصلاح کا امکان انفرادی نہیں ہے ۔

چند افراد ، کیوں ؟ جیسے بھی میں نے " انتخاب " کیا ہو ، زندگی گزار سکتا ہوں ، زمانے اور معاشرے سے کوئی اثر نہ لوں اور آلودہ زمانے اور گمراہ معاشرے میں اپنے آپ کو ایک " پاک " اور " سچا انسان " بناؤں ۔ اگر " فرد " کے لئے معاشرے میں ایسا امکان نہ ہوتا ، تو " ذمہ داری " کے مسئلہ کے کوئی معنی نہ ہوتے ۔

مگر میں اس قسم کی اصلاح کے متعلق شک رکھتا ہوں کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ماحول میں زندگی گزارے اور اس سے اثر نہ لے ؟

ماحول (یعنی ان حالات اور عوامل کا مجموعہ جو تاریخ ، فطرت ، معاشرہ ، انفرادی تعلقات اور خاندان اور موروثی خصوصیات بناتی ہیں اور " فرد " کو اندر اور باہر سے اپنے آپ میں لے کر پروان چڑھاتی ہیں) فرد کو بناتا ہے ۔ اگرچہ فرد بھی ماحول پر اثر ڈال سکتا ہے اور یہ تاثیر اور اثر گزاری تکنیکی فرد کی قوت ارادہ کی ترقی یافتہ خود آگاہی ، علمی و سائنسی اور تکنیکی طور پر آراستہ ہونے کے مجموعہ سے وابستہ

ہوتی ہے۔

فرد جس قدر زیادہ ترقی ، ثقافت اور خود آگاہی سے آراستہ ہو گا، اتنا ہی زیادہ ماحول کی تبدیلی، اصلاح اور معاشرتی انقلاب کی طاقت اور اس کا امکان رکھتا ہو گا اور اس بات کی زیادہ قدرت حاصل کر لیتا ہو گا کہ خود اپنی اور معاشرے کی قسمت کو بنائے یا اس کے بنانے میں حصہ دار ہو اور اسی بنا پر اس کی ذمہ داری اور اس کا عہد زیادہ قابل بحث ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ مسئلہ کہ "اچھا اور صالح فرد" تربیت کیا جائے یا "اچھا اور صالح معاشرہ" بنایا جائے بالکل بے معنی ہے۔

یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ فقط ایک معاشرتی جہاد ہے جس میں انسان فطری اور سچی ترقی پاتا ہے۔ علیحدگی میں فلسفی، شاعر، پارسا عابد تو بنائے جا سکتے ہیں لیکن "مسلمان" نہیں بنایا جا سکتا۔

ممکن نہیں کہ جب زمانہ اور معاشرتی تعلقات، آلودہ ہوں اور معاشرے کی ثقافت، تربیت ، روحانی، سیاسی اور اقتصادی حرکت کا راستہ آلودگی کی طرف رخ کئے ہوئے ہو تو ہم یہ امید کریں کہ ہمارے پاس صالح انسان ہوں گے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے۔

اگر ایک شخص اپنے آپ کو سیلاب اور اجتماعی سقوط سے بچا بھی سکے، اور اگرچہ اس میں کامیاب بھی ہو، پھر بھی وہ نہایت بڑی خیانت کا مرتکب ہو گا۔ اس لئے کہ اس کا سب سے بڑا مشن دوسروں کی اصلاح اور اپنے معاشرے کی اصلاح رہا ہے، جو اس نے انجام نہیں دیا ہے۔ دوسروں سے خیانت کی قیمت پر اپنی خدمت نہیں کی جا سکتی، جو شخص چالاکی اور اپنی جدوجہد سے اس زندان سے، جس میں وہ

اپنے رشتہ داروں ہم خیالوں ہمدردوں اور آزادی کے خواہاں لوگوں کے ساتھ قید ہے ، بھاگ نکلے تو اس نے اپنی آزادی تو حاصل کر لی ، مگر وہ ہر گز ایک آزاد انسان تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک خود غرض ، ذلیل اور آرام طلب اور بے قدر و قیمت شخص ہو گا ۔ اسے حق حاصل نہیں کہ اس آزادی پر فخر کرے ۔ اسے ہر گز اس کا دم نہیں بھرنا چاہیے (کیونکہ) یہ ایک نجات نہیں ، ننگ ہے ۔

میری رائے میں اسلام کا عظیم ترین انقلاب عمل اور انسانی قدر و قیمت اور وہ سب سے بڑی خدمت جو اس نے انسانی تمدن اور تاریخ کی انجام دی ہے ، (صرف مسلمانوں کی نہیں) ، یہ ہے کہ اسلام مذہبی عشق اور معجزہ آسا اور غیر مادی عرفانی احساس کی طاقت کو جو انسانوں کے اندر موجود رہی ہے اور ہمیشہ روحوں کو انقلاب جانبازی ، موت اور شہادت کے سیدھے سادے استقبال اور اپنی اور اپنے بچوں کی راہ میں اپنے معبود کی راہ میں آستانہ عبادت گاہ پر قربانی پر آمادہ کرتی رہی ہے ، انسانی معاشرہ کی تعمیر اور انصاف کے قیام ، دنیا کی اس مادی اور معنوی زندگی میں حصول اقتدار اور ترقی کے لئے کام میں لایا ہے ۔

شاید انسان کی معاشرتی اور معنوی زندگی کی تاریخ میں اسلام کا عظیم ترین انقلاب ، مذہب کی عظیم طاقت کے سمت کی اصلاح ہے ، یعنی ان تمام قوتوں ، خونوں ، وقتوں اور طریقوں کو جو محرابوں ، خانقاہوں ، دیروں اور بت خانوں میں ضائع ہو رہے تھے ، حرکت انسانی معاشرہ کے ارتقاء استبداد اور استحصال اور عوام کی جہالت کے برجوں اور قلعوں کی فنا ، اور روح ، انصاف پسندی ، ثقافت اور اس دنیا کی زندگی کے سب پہلوؤں کی ترقی کی راہ میں کام میں لانا ۔

یہی انفرادی اصلاح تزکیہ نفس اور اخلاقی ارتقاء و تقویٰ کا حصول اور اصلاح نفس کا تنہا طریقہ ہے۔

معاشرے سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنے اور لوگوں کی تقدیر سے غفلت اور معاشرتی ذمہ داری کو فراموش کرنے سے تقویٰ، تزکیہ نفس اور انفرادی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ یہ طریقہ اسلام میں بھی نہیں ہے۔ ہرگز، نہ تو افکار اور ان مکتبی بنیادوں کی تصدیق کی رو سے جو ہم رکھتے ہیں اور نہ ان اشخاص کی رو سے جو ہمارے پاس تاریخ اسلام میں تربیت شدہ افراد کے مظہر کے طور پر تھے، ایسا طریقہ رہا ہے۔

ہم پیغمبرؑ خدا کے ارد گرد کسی ایسے عابد، دیر نشین یا صحابی گوشہ گیر کو نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ اصحاب صفہ بھی، جن سے ہمارے عرفاء اور زہاد اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں، ہاتھوں میں شمشیر لئے مشن اور جہاد کے لئے تیار تھے۔ جنہوں نے اپنے گھر بار اور ذاتی زندگی سے اپنے دل کے رشتہ کو توڑ لیا تھا، لیکن یہ اپنے آپ کو ضائع کرنے اور عبادت گاہوں اور پہاڑوں کے غاروں اور زہد پرستی اور رہبانیت کی درگاہوں کو چومنے کے لئے نہیں تھا، بلکہ اس کے بالکل برعکس اس لئے تھا تاکہ اپنے تمام وجود اور اپنی عمر کے سارے لمحات کو معاشرتی کام اور اپنے اعتقادی جہاد کے لئے وقف کر دیں۔ وہ استثنائی لوگ تھے جنہوں نے اپنی انفرادی زندگیوں کو معاشرتی اور فکری جہاد پر نثار کر دیا تھا۔

ہماری بیسویں صدی کے تمام مسلمان مصلحین بھی یہی فکری خصوصیات اور یہی اصلی اور واضح اعتقاد رکھتے تھے، چونکہ یہ اسلامی بصیرت کے واضحات اور

اسلام کے مسلم اصولوں اور مذہبی عقاید کا ایک حصہ ہیں اور در حقیقت اسلامی مکتب کی " سمت " ، " محاذآرائی " اور روش اور مجموعی بصیرت اور اسلامی روح کا عام رجحان یہی ہے ۔

یہاں تک کہ دشمنان اسلام جو ہمارے پیغمبرؑ کو " مسلح پیغمبر " اور اسلام کو شمشیر کا مذہب کہتے ہیں ، اس بات کے معترف ہیں کہ اسلام ایک معاشرتی مذہب ہے ۔ ورنہ کلاسیکی معنوں میں ، عرفانی جذبے ، تزکیہ نفس ، انفرادی اصلاح ، دینی تقویٰ کو تو شمشیر کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ ایسے کام تو ہر حکومت اور ہر حالات میں کیا جا سکتا ہے ۔ استبداد ، استحصال ، ظلم ، غصب اور جرم نہ صرف اس کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ تو تمام ضروری اور مناسب حالات کو فراہم کرتے ہیں تاکہ آدمی ایک گوشے میں چلا جائے اور لوگوں کے کام اور تقدیر سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور نفس سے جہاد کرے ۔ وہ اس جہاد میں انسان کی مدد کرتے ہیں ۔

اسلام میں فرد معاشرے کی اصلاح کے جہاد کے دوران انفرادی اور اخلاقی اصلاح تک پہنچتا ہے اگرچہ وہ اپنے جہاد میں کامیاب بھی نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری رائے ہے کہ ایک آلودہ معاشرے میں بھی ایک صالح فرد کا وجود ہو سکتا ہے ، یعنی وہ بنایا جا سکتا ہے اور انفرادی ذمہ داری یہیں سے پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ فرد کی ذمہ داری لوگوں کو خودآگہی دینا اور تمام گمراہ کن ، مریض کرنے والے ، ترقی سلامتی اور حقیقت کے مخالف عناصر سے جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بھی یہی معنی ہیں ۔

مسلمان فرد خدا کے روبرو ، یعنی لوگوں کے راستے ، سرنوشت اور طرز تفکر

کے بارے میں ذمہ دار اور اس کا عہد کئے ہوئے ہے ۔ فکری عہد بھی اور علمی و معاشرتی عہد بھی ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی وہی اصول ہیں جو آج مغرب میں اور بیدار دنیا کے سامنے اور معاصر روشن خیالوں کے درمیان " انسان اور روشن خیال دانشور اور فنکار کی ذمہ داری اور اس کے عہد کا مسئلہ " کے عنوان سے زیر بحث ہے ، بے بنیاد اور بچگانہ نصیحتوں کے طور پر نہیں ۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی ہیں فرد کی اپنے معاشرے اور جس مکتب کا وہ پیرو ہے اس کے متعلق سونپی گئی ذمہ داری ، یعنی وہی روشن خیال شخص کی ذمہ داری ، ایک مسلکی انسان کی ذمہ داری جو کسی نظریے پر اعتقاد رکھتا ہو ۔

افسوس ہے کہ میرے پاس فرصت نہیں ہے کہ بیسویں صدی کے مصلحین کے بارے میں ایک ایک کر کے بات کروں ۔ اگر ایک ایک کا نام لینا چاہوں تو مجھے ان کا نام لینے ، ان کے آثار اور زمانے کی یاد دہانی ، اور ان کی زندگی کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرنا ہو گا ، اور وہ بھی بے فائدہ ہے ، مگر میں ان بنیادوں اور اصولوں پر بحث کرتا ہوں جن پر اسلام کی تحریک بیداری یا یعنی نشاۃ ثانیہ یا نئی پیدائش کا انحصار ہے تاکہ مسلمان اور روشن فکر افراد کم از کم اس کی سمت ، اور مجموعی کوائف کا احساس و ادراک کر سکیں ۔

اپنے حقیقی معنوں میں " رناسنس " ① کا لفظ اس تحریک کے لئے کہیں زیادہ معنی رکھتا ہے اور اس روح اور معنوں کے پیش نظر جو اس تحریک کے رہبر

---

1. Renaissance

اور پیروکار اس کا مفہوم سمجھتے رہے ہیں، یہ لفظ زیادہ مناسب ہے بہ نسبت اس معنی کے جو پندرہویں اور سولہویں صدی میں قرون وسطی کی یورپی تحریک کے لئے مستعمل رہا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ تاریخ بھی واضح طور پر دکھاتی ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ دوبارہ پیدا ہو تو یہ مردہ اسلامی معاشرہ پہلی درخشاں پیدائش کی طرح ثمر بار، اور طاقتور ہو کر ترقی کرے گا۔

تاریخ معاشرہ کی پہلی پیدائش کو اسلام کے بارے میں کیوں کر دکھاتی ہے؟ کس طرح سے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے؟ یہ نہیں کہتی ہے کہ "جس زمانے میں پیغمبر اسلامؐ کی ولادت ہوئی، کتب خانے زیادہ ہوگئے۔ عرفان نے چمک دمک اختیار کی، خدائے عشق رقص کرنے لگا، خدائے علم ہیجان میں آگیا، خدائے جنگ مریخ لرز گیا، ہرکولس کے ہاتھوں سے تیر کمان گر گئے، آسمان سے ایک نور چمکا، زمین کو زلزلہ آیا" ۔ نہیں، بلکہ فارس کا آتش کدہ، جھوٹی آگ بجھ گئی اور ساسانی محل کا کنگرہ گر گیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک پر معنی پیدائش ہے ایک نئی روح اور نیا عرفان اور ایک احساس اور ایک اشراق ہے کہ مذہب کی صورت میں ہے۔

مگر تمام رائج مذاہب کے برخلاف اسے اینٹ سے، اس اینٹ سے کہ جس پر ٹیڑھی عمارت تعمیر کی گئی ہے، سروکار ہے۔ اسے ہر اس درودیوار اور بنیاد سے سروکار ہے جو ستم سے اٹھی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پیغمبرؐ نے اس لئے ظہور نہیں کیا ہے کہ خود کو زرتشت، مانی، مزدک اور کنفیوشس وغیرہ کی طرح اس محل تک پہنچائے اور دربار میں شاعر، منشی اور خواجہ کی صف میں آ بیٹھے، بلکہ یہ تو اس لئے آیا

ہے اس محل کو ویران کردے۔

" جیسے ہی پیغمبر اسلامؐ نے جہان میں آنکھ کھولی فارس کا آتش کدہ بجھ گیا اور کاخ مدائن کا کنگرہ گر گیا"

یہ اسلام کے زاویہ نگاہ اور اس دنیا اور معاشرے میں اس کے مشن کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

افسوس ناک طور پر مسلمان روشن خیالوں کے ایک گروہ کے افراد یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو آج کی روح کے مطابق اور آج کی زبان میں بیان کریں اور ہمارے زمانے کی روح جس فکر اور روش کو بھی پسند کرتی ہو اور جو آج کا فیشن ہو اس طرف رخ کریں۔آج بھی جب عالمی امن ، صلح آمیز بقائے باہمی ، عدم تعصب تمام عقاید و افکار کی آزادی اور ان کا احترام فیشن ہو گئے ہیں ، ہمارے مسلمان روشن خیال ، یا ہمارے نئے روشن خیال بھی حریت پسندوں ، جمہوریت کے حامیوں اور فلسفہ مرکزیت انسان کے پیروؤں کے لئے بیان کرتے ہیں کہ اسلام " سلم " سے ہے اور سلم کے معنی صلح اور صلح کے معنی صلح آمیز بقائے باہم اور طبقات ومذاہب ، افکار و عقاید کے مابین افہام و تفہیم پر مبنی دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے ! اسلام صلح نہیں ، اسلام جنگ ہے ۔ پادریوں اور استعمار گروں اور ان کے ہمدست ظاہری روشن فکروں کے اتہامات سے نہیں ڈرنا چاہیے اور سراسیمہ نہیں ہونا چاہیے ۔اسلام کا میک اپ کر کے اور اس کو آج کا ظاہر کرنے سے کام آگے نہیں بڑھے گا۔ حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے جاننا چاہیے نہ کہ ویسے جیسے کہ وہ پسند کرتے ہیں ۔جہاد کی توجیہ دفاع کے عنوان سے نہیں کرنی چاہیے ۔

دفاع کے دوسرے احکام ہیں اور جہاد کے دوسرے احکام ہیں ۔ اسلام آدمؑ سے تاریخ کی انتہا (آخرالزمان) تک حق اور باطل کی جنگ ہے ۔

وہ تحریک جو اسلام کے ماحول میں آخری مصلحین کے ذریعے ، چین سے لے کر خلیج فارس اور شمالی افریقہ تک ، انیسویں صدی کے اواسط سے اب تک وجود میں آئی ہے ، ان تاریخی تحریکوں کے تسلسل میں ایک تحریک ہے ، جن کی بنیاد پر ادیان ابراھیمی کے فلسفے کی تاریخ استوار ہے ۔ یہ تحریک کلامی ، فلسفی اور ماورائے طبیعاتی مسائل کے چوکھٹے میں محصور نہیں ہے ۔ اس مبارزے کے تیز کنارے اس عینی نظام کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں ، جو تاریخ ، زندگی اور لوگوں پر حکم فرما ہے ۔ اپنے سامنے ایشیا اور افریقہ کا نقشہ کھول لیں ۔ ہم افریقہ کے جغرافیہ کو بہتر طور پر پہچانتے ہیں ۔ کیونکہ افریقہ میں جو استعمار اور مغرب کے خلاف انقلابات اور تحریکیں وجود میں آئیں انہیں پہچانتے ہیں ۔ وہ زمانہ حال کے زیادہ قریب ہیں ۔ ابھی خبروں کا حصہ ہیں ۔ ہم سب جانتے ہیں ۔

افریقہ میں اسلامی اقوام اور ممالک کا ایک سلسلہ ہے اور غیر اسلامی اقوام اور ممالک کا ایک سلسلہ ۔ لیکن دنیا کے جغرافیائی نقشہ پر سب افریقہ اصلاً شمالی افریقہ کے رہنے والے فرانسیسی مصنف ، شاندل کے بقول ایک " قطرہ اشک " اور ایک " گرم اشک کے قطرہ " کی صورت میں ہے ۔ جی ہاں افریقہ زمین کا اشک ہے ، زمین کا پگھلا ہوا دل ہے ۔ دل بھی اشک کے مشابہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ دونوں کی پیدائش ایک ساتھ ہوئی ہے ، اور دونوں کا درد مشترک ہے ۔ افریقہ نیز ان دونوں کا رشتہ دار ہے ۔

تاریخ میں صرف افریقہ کے اسلامی ممالک ہیں کہ جن پر اتفاقاً غلام بنانے کا الزام ہے ، مگر غلام دینے کا الزام ہرگز نہیں ہے۔ ہرگز کبھی کوئی مراکش ، ٹیونس یا مصر و الجزائر سے کہیں بھی غلام لے کر نہیں گیا۔ جدید دور میں تمام افریقہ نے زبردستی،طاقت،یا مکر سے استعمار کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ مرکزی مغربی اور مشرقی افریقہ نے حال ہی میں محسوس کیا ہے کہ کب استعمار آیا اور کس سادگی سے وارد ہو گیا۔

استعمار: مسیحی مبلغین یا یورپی مہاجروں کی صورت میں جو سرمایہ کاری ، آبادی اور پیداوار اور کام کاج اور ترقی کے لئے آتے ، تاکہ ایک گوشے میں زندگی گزاریں اور اس کی آبادکاری میں مصروف ہوں (استعمار کے یہی معنیٰ ہیں) یا فرانس انگلستان وغیرہ کے تاجروں کے ایک گروہ کی شکل میں آتے ، سادگی سے ، اور یہاں تک کہ مقامی لوگوں کے استقبال اور بعض اوقات ان کی موافقت اور خوشنودی سے داخل ہوتے اور آہستہ آہستہ تمام چیزوں کے مالک بن جاتے۔

انیسویں صدی میں نئے نئے انہوں نے رنگدار شیشوں سے اور مصنوعی جواہر، ہیرے بنائے تھے۔ فرنگی رند مٹھی بھر رنگدار شیشوں کو اٹھالیتا اور افریقہ لے جاتا۔ افریقہ کے رؤسا اور اشراف اور قبائل کے شیوخ کو تحفے کے طور پر پیش کرتا ، خصوصاً جشنوں ، شادی اور قبیلے کی تقریبات میں مٹھی بھر شیشہ دے دیتا اور اس کے مقابلے میں بھیڑوں کا ایک گلہ لے لیتا تھا۔

فیشن پرستی غیر متمدن صحرائی فکر اور روح کی اصلی خصوصیات میں سے ہے جدید صحرائی اور غیر جدید صحرائی میں فرق نہیں ہے۔ فیشن پرستی ان سطحی اور غریب

روحوں کی ضرورت ہے جو روح کی خوبصورتیوں اور معنوی سرمایوں ، مناظر ، انقلابوں اور ان عظمتوں سے محروم ہیں ، جو ایمان ، فکر ، علم ، ہنر ، ادب ، فلسفہ اور آدمی کے دل کی عجیب و غریب پروازوں میں سے ہیں ۔ اس حقیقت کا مطالعہ ان افراد کے درمیان موازنہ کرنے سے جو فکر اور ثقافتی اور معاشرتی ترقی کے لحاظ سے مختلف درجات رکھتے ہیں ، کیا جا سکتا ہے ۔

یہ کل کا افریقہ تھا ۔ استعمار بلّی کی طرح خاموشی سے بغیر قدموں کی آہٹ کے افریقہ میں داخل ہوا ۔ کوئی نہیں سمجھا کب اور کہاں سے آگیا ۔ اس وقت سمجھے جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ہزاروں بچے جن چکا ہے اور اس کی چوتھی ، پانچویں یا چھٹی نسل ہے ۔ اس وقت سمجھے جب انہوں نے دیکھا کہ اس امر کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے کہ آیا افریقائی ملک میں حکومت کے لئے خود افریقیوں کو رائے دینے کا حق ہے یا نہیں ، آج افریقہ کے پاس جو موکینیاٹا اور لوممبا........ کی مانند بڑے رہبر اور مفکر ہیں ۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ نیلی آنکھ والے کس طرح آئے اور کیوں کر افریقہ میں گھل مل گئے ۔ کینیا کے دانشمند رہبر جو موکینیاٹا کہتا ہے : "جب یہ یورپی آئے ہمارے پاس زمین تھی ۔ ان کے پاس انجیل تھی ، لیکن اب ان کے پاس زمین ہے ہمارے پاس انجیل ! "

مگر سیاہ غیر مسلمان افریقہ کے برعکس ۱۸۱۳ء سے ۱۹۶۱ء تک دیکھیں ۔ شمالی افریقہ اور افریقہ کے اسلامی معاشرے میں کونسے سال تلوار رکھ دی گئی ۔ یہاں تک کہ صحراؤں اور صحرا کے قبائل ، شمالی افریقہ کے دور افتادہ گاؤں ، ثقافت اور قومی آزادی ، انسانیت ، وقومیت و مذہب ، تمدن اور قومی اور اسلامی زبان کے وفاداروں اور

نگہبانوں اور ہوشیار، باقدرت، متمدن فرانس کے عملی اور ثقافتی، اقتصادی اور فوجی معاشرتی علوم کے ماہرین کے ہر طرف سے حملہ کی وجہ سے میدان جنگ بن گئے اور فرانسیسیوں سے پہلے ہسپانوی تھے اور مصر میں انگریز بھی تھے۔ آخر کار یورپ نے شکست کھائی۔ یہ جنگ ایک صدی سے زیادہ ۱۲۰ سال تک جاری رہی۔ چار پانچ نسلیں آئیں اور گئیں اور یہ فرانسیسی نہ بن سکے۔ فرانسیسیوں نے اعلان کیا: "جس طرح سے دریائے سین پیرس کے درمیان سے گزرتا ہے، اس طرح بحیرہ روم بھی فرانس کے درمیان سے گزرتا ہے" اس لئے کہ بحیرہ روم کے اس طرف الجزائر، ٹیونس اور مراکش ہیں اور اس طرف فرانس ہے اس بنا پر بحیرہ روم فرانس کے وسط سے گزرتا ہے۔ جب افریقہ میں داخل ہوتے تو بعض جگہوں پر ناگہاں سائن بورڈ دیکھتے جس پر لکھا ہوتا "یہاں فرانس کی سرحد ہے"! مقصد یہ تھا کہ وہ فرانس کی ثقافت میں اس طرح گھل مل جائیں کہ وہ خود کو فرانسیسی سمجھنے لگیں۔

استعمار کیوں تیار ہے کہ افریقائی بربر اور عرب کو جن کی نسل کی ہمیشہ تحقیر کرتے ہیں اور انہیں صحرائی چوہا کہتے ہیں، "فرانسیسی کہے"؟ اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے اپنی قومیت میں ضم کر لے، اسے اپنی برتر اور مالک نسل کا حصہ بنا دے، مگر وہ خود کو مسلمان محسوس نہ کرے؟

اس لئے کہ اس نے خود کو مسلمان محسوس کر لیا تو ایک مرتبہ خود کو فکر و تمدن و ثقافت و ہنر اور فطانت اور رزم کے ایک ہزار تین سو سالہ تاریخ سے متصل پا لے گا اور اس پر سوار نہیں ہوا جا سکتا۔ لہٰذا اسے ثقافت سے عاری اور شخصیت سے محروم کرنا چاہیے۔ ایسا شخص، جس نے تازہ رسوم اپنائے ہوں اور جس کی آرزو فرنگی

سے نزدیک ہونا ہو! ایک مسلمان جو اپنی فکری، تمدنی، اخلاقی اور رزمیہ ثقافت، تاریخ، معنویت اور غنی و عظیم شخصیت کا احساس کرتا ہو۔ ہرگز فرنگی کا آلہ کار نہیں بن سکتا۔

مگر افریقہ کے مسلمان جو اپنے آپ کو ایسے تمدن اور ایسے ماضی کا وارث محسوس کرتے تھے۔ استعمار انہیں رام نہیں کر سکا۔ فرنگی جلال و جبروت سے ان کی آنکھیں چندھیائی نہیں اور استعمار کے خلاف جنگ مسلسل جاری رہی۔ ہرچند کہ وہ مختلف اور پراگندہ صورتوں میں تھی مگر پراگندہ اور ضعیف کیوں؟ اس لئے کہ ان کی ثقافتی و اسلامی خود آگہی کمزور اور پراگندہ ہو گئی تھی۔ معاشرہ روایتی انحطاط پذیر ہو چکا تھا، یہاں تک کہ تین ممتاز مصنفوں کی تصدیق کے مطابق جنہوں نے مسلمان افریقہ کی بیداری کی تاریخ لکھی ہے (یعنی فرحت عباس، عمر اوزغان اور ہنری مارٹینا) اگر ہم کسی ایسے دن کا تعین کرنا چاہیں جب شمالی افریقہ کی تحریک بیداری شروع ہوئی تو وہ وہ دن ہے جب محمد عبدہ مصر سے مغرب (ٹیونس، مراکش اور الجزائر) آئے انہوں نے نہ کوئی جلسہ بلایا اور نہ کوئی اسلحہ اٹھایا اور نہ ہی سیاسی جوڑ توڑ کروایا۔

محمد عبدہ آتے ہیں اور تمام علماء کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں "فی الحال قدیم علوم کی تمام شاخوں کو چھوڑ دو اور صرف قرآن کی آگاہانہ تفسیر اور لوگوں میں قرآن سے آشنائی کرانے میں مشغول ہو جاؤ"

انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار قرآن شناسی کی یہ روایت علمائے اسلام کے روشن فکروں اور ترقی پسندوں میں رائج ہوئی، ورنہ قرآن جیسے کہ ہمارے درمیان معمولاً رواج ہے۔۔۔ پڑھنے اور سمجھانے کے لئے نہیں ہے، اس کے معنی ہم پر

مخفی اور پوشیدہ ہیں ، یہ قرآن کھل گیا اور یہ جامد یونیورسٹیاں اور اسکول اور قدیم مدارس کے غبار آلودہ دروازے کھل گئے اور ایمان ، تفکر ، ذمہ داری ، سیاسی اور اجتماعی شعور ، انسانی خود آگاہی اور سمت یابی اور راہ یابی کی جانب تحریک شروع ہوئی ۔

محمد عبدہ جو سید جمال الدینؒ کی فکری تحریک کے نتیجے میں بیدار ہونے والوں میں سے ایک ہیں ، ان کے ہاتھوں نئی باتیں اور جدید نعرے آئے ۔ قرآن کی طرف واپسی کی تحریک کے فوراً بعد " جامعہ علمائے اسلامی " کی تشکیل ہوتی ہے ۔ مذہبی بصیرت اور روشن خیالی کی اس تبدیلی کی انقلابی اور معاشرتی قدروقیمت کا وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے جو استعمار کے ثقافتی نقشوں کو خصوصاً انیسویں صدی میں پہچان لے ۔ نیز فکری اور ثقافتی انقلاب کے اثر کو انقلاب اور اجتماعی بیداری پر مثلاً قرون وسطیٰ کے یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور پروٹسٹنٹ مذہب پر ، اچھی طرح جان لے ۔ یہ وہ صدا ہے جو سید جمال الدینؒ نے بلند کی تھی ۔

یہی وجہ تھی کہ شمالی افریقہ کے معاشرے میں مذہبی بصیرت اور فکر کے اس دھچکے کے بعد مسلمان شمالی افریقہ کی ثقافتی ، اقتصادی ، فوجی اور سیاسی تسلط سے نجات کے لئے پہلی سیاسی جماعت " ستارہ شمالی افریقہ " کے نام سے تشکیل پائی اور یہی محاذ تھا جس نے بعد میں مختلف جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں مسلح جنگ کا آغاز کیا اور اسے جاری رکھا یہاں تک کہ شمالی افریقہ کی مسلمان قومیں آزاد ہو گئیں ۔ افریقہ کے مسلمان معاشروں کے آزاد ہونے کے بعد ہی افریقہ کے سیاہ معاشروں کی آزادی کا آغاز ہوتا ہے ۔

اب اس سوال پر بحث ہونی چاہیے کہ استعمار کے خلاف آزادی بخش جنگ میں مسلمان قومیں کیوں غیر اسلامی قوموں پر مقدم ہوئیں؟ ایک ہی براعظم میں یہ پہلے کیوں بیدار ہوئے اور ان سے پیشتر فرانس اور انگلستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور مغربی طاقت کے اثر میں بھی دیر سے آئے؟ مسلمان جو مغربی ثقافت و تمدن کی یورپ کے مقابلے میں کھڑے ہوئے، اس لئے کہ ان کی ایک عظیم معنوی اور ثقافتی بنیاد تھی جس کی انہوں نے حفاظت کی تھی اور یہ عظیم اسلامی ثقافتی بنیاد ہے جو ایک تعمیری، طاقتور اور فکر، روح اور جذبہ کو حرکت میں لانے والی ثقافت ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک مسلمان اس ثقافت کے سلسلہ میں اپنی معاشرتی ذمہ داری کا احساس نہ کرے۔

اسلامی ثقافت بودھ، وید کی طرح یا، عیسائی، زرتشتی اور مانوی مذہبوں کی طرح ایک روحانی اور اخلاقی اور ماورائے طبیعی مذہبی ثقافت نہیں ہے، بلکہ ایک معاشرتی، سیاسی، رزمیہ اور ذمہ داری کی ثقافت بھی ہے۔

ایسا قرآن جو تمام مذہبی، فقہی اور معمولی احکام سے زیادہ جہاد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور وہ پیغمبرؐ جس نے اپنے معاشرے کے لئے تمام عمر دشمن کے خلاف سیاسی اور فوجی جہاد میں گذاری ہو، اور جس نے مدنی زندگی میں اوسطاً ہر پچاس دنوں میں ایک فوجی کاروائی کی ہو، اسلام کی تاریخ جو جہاد، رزم اور طاقت کی تاریخ ہے، کس طرح ممکن ہے (ان حقائق سے) ایک آگاہ مسلمان کو جمود، غلامی، سیاسی ذلت اور نشے کی حالت میں رہنے دے، وہ اسلام جس پر یہ الزام ہے کہ یہ تلوار کا دین ہے وہ ان ادیان سے مختلف ہے، جو نشہ آوری کے دین ہیں۔ انیسویں صدی میں یعنی

انیسویں صدی کی تیسری چوتھائی میں تمام اسلامی معاشرے مختلف پختہ و ناپختہ صورتوں میں عوام کی طرف سے اور علمائے اسلام کی رہبری میں استعمار کے تسلط کے خلاف متحدہ شورش و بغاوت کی حالت میں رہے ہیں ۔ خود ایران میں تنبا کو کی تحریک جس کی اہمیت ہم درست طور پر نہیں پہچانتے ۔ یہ تحریک آقای میرزا حسن شیرازی کے مختصر سے فتویٰ سے آغاز ہوتی ہے ۔ یہ ہے میرزا حسن شیرازی کا فتویٰ:

"آج کے بعد، تمبا کو کا استعمال جس شکل میں بھی ہو، امام زمانؑ سے جنگ کا حکم رکھتا ہے" ۔

دیکھئے اسلام میں کس طرح سے دین اور دنیا قابل تفکیک و جدائی نہیں ہے اور قطعاً قابل تشخیص نہیں ۔ استعمار نے ہمارے منہ میں یہ بات ڈالی کہ مذہب زندگی سے جدا اور ہمارے روشن خیالوں نے بھی طوطے کی طرح سے اس کو دہرایا، اس خیال سے کہ کلیسا کے مقابلے میں یورپی روشن خیالوں کی تقلید کر رہے ہیں ۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے ۔ آیا اس بڑے آدمی گاندھی کی "منفی مقابلے کی تحریک" جو تحریک تمبا کو کے تھوڑے عرصے بعد واقع ہوئی، اسی تحریک کے تحتِ اثر واقع نہیں ہوئی ہے "میرزا کی اقتصادی استعمار کے خلاف تحریک وہ استعمار جو رژی کمپنی کی شکل میں (ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح سے) ایران میں داخل ہوا، تمبا کو حرام قرار دینے کی تحریک اور رژی کمپنی کے خلاف مزاحمت کے بعد گاندھی نے انگلستان کے خلاف منفی تحریک اور انگلستان کے بنے ہوئے کپڑوں اور سامان کا تمام ہندوستان میں بائیکاٹ کا اعلان کیا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خالی ہاتھوں سے برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر کے دشمن

کے ہاتھ کاٹ دیئے اور انگلستان نے اپنی طاقت کے معراج کے زمانے میں اس زرخیز براعظم (برصغیر) کو اپنے ہاتھ سے کھودیا۔

استعمار اس وقت اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جب مقامی لوگ اس کی مصنوعات کے ایجنٹ اور اس کے مال کے صارفین بنیں۔اگر یہ مزاحمت کریں، متحد ہو جائیں، اور اپنی مصنوعات کو استعمال کریں، استعمار مر جاتا ہے چنانچہ انہوں نے پہلے ہمیں جدت پسند بنایا، پھر ہم پر سوار ہو گئے۔ایران میں آئینی حکومت کی بیداری کے آغاز کے نشانات کو انیسویں صدی کے اواخر میں جستجو کرنا چاہیے۔ایران میں انصاف کا مطالبہ، آئینی حکومت، اور انفرادی استبداد کو رد کرنے کا اعلان انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا اور یہ سب عظیم ترین انقلاب سے پہلے ہے کہ آئینی حکومت کی تحریک تمام تر ایک سیاسی مسلح جنگ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ ہر مسلح انقلاب کے پیچھے ایک فکری اور ثقافتی تحریک ہوتی ہے، جس سے انقلاب جنم لیتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں تمام مسلمان افریقہ (تیونس، الجزائر، مراکش، مصر، سوڈان وغیرہ) نے مسلح اسلامی متحدہ بغاوتوں اور یورپی سپاہیوں پر حملوں کی صورت اختیار کرلی۔برصغیر ہند میں بھی اگرچہ سیاسی اور فوجی نگاہ سے یہ تاخیر سے ہوئی، لیکن اس میں انقلاب کے خمیر اور پیدائش کی ایک رو کو اسلامی ثقافت میں ڈال دیا گیا، جو عینی اور قابل مطالعہ و غور ہے۔وہ چیز جس نے ہندوستان کی استعمار دشمن تحریک کو توانائی اور معنوی و روحانی غذا دی اور اس کے لئے پس منظر فراہم کیا۔

مگر اس وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے اسلامی ملکوں کی، جہاں اسلامی ثقافت حکمران ہے، یہ بغاوتیں، یہ سب انقلاب اور دائمی بیداری، ان لوگوں کی مرہون منت ہے، جنہوں نے اخیر صدی میں زمانے (کی مخالفت) اور مشکلات کے باوجود اسلامی ثقافت کی تعمیر نو، اقبال کی اصطلاح میں یا جدید زمانے کی اصطلاح کے مطابق "تجدید ولادت" کی ان لوگوں نے مکتب اسلام کے جداجدا ہوئے ٹکڑوں کو الگ الگ حل کر کے اور ان کی نشوونما کر کے شروع سے اور پہلے کی طرح دوبارہ افکار کی صورت میں سب کو منظم اور مدون کیا اور دکھادیا کہ یہ ہے فکر اسلامی کا مکمل اور کامل پیکر اور یہی تھے اسلام کے باخبر مفکرین اور علماء۔!!!

سید جمال الدینؒ نے جو نشاۃ ثانیہ اسلام کی تحریک اور بقول اقبالؒ بنیاد فکر اسلامی کی تجدید" کے اولین بانی تھے۔جو نام اس تحریک کے لئے منتخب کیا وہ "تحریک سلفیہ" تھی، یعنی وہی گذشتہ زندگی کی طرف واپسی کی تحریک یا بہتر لفظوں میں آج کے مردہ اور بے حس وحرکت جسم میں دوبارہ پہلی جیسی زندگی لانے کی تحریک۔یہ ولادت کی تجدید ہے۔ایک انقلابی، مترقی تحریک، موجودہ بوسیدگی، نشہ آوری، خوابیدگی، موت، توقف اور انحطاط جو (امراض) ایک متحرک معاشرے اور قوت بخش اور مترقی مذہب کو عارض ہوئے ہیں ان کی مخالف تحریک۔

کیا (یورپ) کی نشاۃ ثانیہ کی فکر جو کلیساء اور مکتبی اور قرون وسطی کے پر جمود و اختناق حالات کے خلاف اور یونان کے سنہرے مقتدر زمانے کی طرف واپسی کا اعلان تھی، ایک رجعت پرستانہ تحریک تھی؟

ظاہری، رسمی اور فوری طور پر فیصلہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ واپسی کی ہر

تحریک ، پرانی ، فرسودہ اور رجعت پرستانہ تحریک نہیں ہوتی ۔ وہ پہلے معاشرے اور قومیں جو استعماری تمدن اور ثقافت کی قدروں اور مغرب پرستی کی بیماری کے باوجود یورپ کی زبردستی مسلط شدہ تمدن کے فضائل کے خلاف ڈٹی رہیں اور ان سے جہاد شروع کیا ، مسلمان معاشرے اور قومیں تھیں اور استعمار اور مغرب زدگی کے نقطہ آغاز سے غیر یورپی ، استعمار زدہ اور مغرب پرستی کی ماری دنیا نے اپنی خودی اور مغربی ثقافتی قدروں کی نفی کرنے کی تحریک کا آغاز کر دیا تھا ۔

یہ گذشتہ صدی خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد کا واقعہ ہے کہ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے راہنماؤں اور عظیم مفکروں کی بڑی تعداد نے مثلاً امہ سزر ، علیون دیپ ، سنگور ، فرانتزفانون ، ٹیگور رادھاکرشان اور سن یات سن نے یورپی تمدن کی ثقافتی قدروں پر حملہ کر دیا اور کہا کہ مغربی تمدن عظیم ترین اور تنہا انسانی تمدن نہیں ہے ۔ ہماری بھی ثقافت ہے ۔ قومی اور ملی ثقافتیں ہیں اصیل مذاہب ہیں اور فنون کی قومی قدریں ہیں ۔ لیکن اس وقت تک تمام مقامی قومیں ، یہاں تک کہ تاریخی طور پر متمدن معاشرے اس بات پر قانع ہو چکے تھے کہ عظیم ترین درخشاں تمدن اور جدید ترین انسانی قدریں بلا مقابل مغرب کی قدریں ، تمدن اور ثقافت ہیں

مسلمان مفکر اور یہ ترقی پسند اور استعمار شکن علمائے اسلام وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک تنقیدی روح ، ایک منفی نقطہ نظر کے جذبے کے ساتھ خطرے کا اعلان کر کے اس کے مقابل ڈٹے رہے اور خودی کی طرف واپسی جو عصر حاضر میں "کالوں کی کانگرس" یا امہ سزر اور سنگور ، اور جولیس نیرہ جیسی شخصیات نے دنیا میں اعلان کیا ہے ، تو سو سال سے زیادہ عرصہ گزارا ہے کہ مغرب کے تمام وحشت ناک

اور تباہ کن تمام چہروں کے حملہ ، اقتصادی ، فوجی مغرب اور مغرب کے خطرناک ترین چہرے یعنی مغرب کے فکری استعمار کے خلاف اسلامی مفکرین نے اعلان کر دیا تھا۔

جی ہاں! مغربی استعمار کا خطرناک ترین اور اسی ضمن میں سب سے زیادہ نہ پہچانا ہوا ، اور سب مخفی چہرہ اس کی ثقافتی اور فکری استعماریت ہے جو پہلے فکر، تعصب اور تعمق کو ختم کر ڈالتی ہے ، دین کے متعلق ہمارے طرز تفکر کو بدل دیتی ہے اور غیر یورپی معاشرے کے اندر اور ان کے اذہان میں اپنے اثر و رسوخ اور استقرار کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیتا ہے اور اس کے عقب میں اقتصادی اور فوجی حملہ لے آتا ہے۔ اگر ثقافتی استعماریت کا وجود نہ ہوتا تو راستہ کھلا نہ ہوتا۔

پہلی بار روشن فکر مسلمان ہی تھے کہ جنہوں نے استعمار کے مکروہ چہرے سے اس ثقافتی روشن فکری اور تمدن کے نقاب کو اٹھایا ، وہ ثقافتی استعماریت کہ جس کا کام ثقافت کا خاتمہ ، مذہب کی نفی ، معنویت روح اصالت کو مٹانا اور معاشروں میں اخلاقی اور تمدنی فضائل کی غارت گری تھا۔ انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ مغربی استعمار کے حملے کے خلاف کھڑا ہونا چاہیے اور یہ وجہ ہے کہ الجزائر کے علمائے اسلام نے شعوری طور پر جہاد میں اس نعرہ کو اپنا عنوان بنایا کہ "اسلام دیننا والعربیتہ لساننا ، والجزائر وطننا" (اسلام ہمارا دین ہے۔ عربی ہماری زبان ہے اور الجزائر ہمارا وطن ہے) ۔ اس واسطے کہ وہ لوگ اس موقع پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ فرانس اس لئے نہیں آیا ہے کہ جدید تمدن لے آئے اور جدید مصرف لائے اور یہاں تک کہ صرف مادی مفادات حاصل کرے اور ثروت و دولت کے ذرائع کو لوٹ

لے ، نہیں بلکہ وہ اس لئے آیا ہے کہ انسان کو مسخ کردے اور تاریخ کو بدل دے اور سب انسانی قدروں کو فنا و نابود کردے ۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی استعمار یہ کہتا ہے فرانسیسی آپ کی زبان ہو اور فرانسیسی آپ کی قومیت ہو ، اور کوشش کرتا ہے کہ عیسائیت آپ کا دین ہو ، اور یہ محسوس کرتا ہے کہ استعماری نعروں کے ساتھ ان نعروں کو بلند کرنا چاہیے ۔

یہ ہے روشن خیال ، استعمار کے خلاف ترقی پسند سیاسی اور استعماری اور معاشرتی آگاہی رکھنے کا مطلب ، نہ یہ کہ مغرب سے جو کچھ بھی برآمد کیا جائے اسے طوطے کی طرح روشن خیالی کے نام پر ترجمہ کرنا ، اور آج وہ دن ہے کہ جوان روشن فکروں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد استعمار زدہ دنیا ، خصوصاً افریقہ میں اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور استعمار کے ثقافتی حملے اور لوٹ مار کے خطرہ کا اندازہ کرلیا ہے ۔ یہ وہ اصول ہے جس کے پیچھے افریقہ کے کالے اور لاطینی امریکہ کے روشن خیال راہنما لگے ہوئے ہیں ۔

نیرہ مشرقی افریقہ کے معاشرہ شناسوں ، راہنماؤں اور مفکروں میں سے ایک ہے ۔ اس کی اپنی اور اس کے معاشرے کے تمام تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد کی زبان انگریزی ہے ۔ اس نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی ہے اور لندن میں بھی کچھ سیکھا ہے مگر اس کے ملک کے عوام اور ان پڑھ لوگوں کی زبان "سواحلی" ہے ۔ اس بنا پر اس نے اعلان کیا ہے کہ سواحلی زبان ، جو اگرچہ ایک نیم وحشی مقامی اور انحطاط پذیر زبان ہے اس کو اپنی یونیورسٹیوں کالجوں اور مدرسوں میں تحقیقی ، علمی اور سیاسی انجمنوں اور اداروں میں انگریزی کی جگہ لایا جائے ۔

یہ ایک انتہائی ترقی پسند اور روشن خیال شخص کا طرز تفکر ہے ۔جسے دنیا ایک انقلابی عنصر کے طور پر جانتی ہے ۔وہ تمام افراد جو بیسویں صدی کے انقلابی راہنماؤں کے طور پر پہچانے گئے ہیں ، اور روئے زمین پر مغضوب اور معتوب حلقوں سے وابستہ ہیں ، انہوں نے اس اصول کو اپنا نعرہ بنایا ہے ۔" مغرب کی ثقافتی قدروں اور قالبوں کو مسترد کر دینے اور اپنی حقیقت ، اصالت اور ثقافتی قدروں کی طرف واپسی کا اصول۔

آپ ان تمام تحریکوں کے درمیان میں جو ثقافتی اور یہاں تک کہ سیاسی اور اقتصادی طور پر مغربی استعمار کے خلاف ردعمل کی صورت میں وجود میں آئیں اور جہاد اور بغاوت کو وجود میں لائیں ، ترقی پسند ، شجاع اور آگاہ علماء کے چہروں کو دیکھتے ہیں ۔

بے شک بغیر استثنا کے میں یہ بات ایک مسلمان یا مذہبی مبلغ کے طور پر نہیں کہتا ، بلکہ یہ ایک تاریخ اور معاشرتی علوم کی حقیقت ہے ۔ مجھے روشن خیال افراد کے اس گروہ سے کوئی کام نہیں ، جو مذہب اور علمائے اسلام کے بارے میں وہی درآمد شدہ یورپی فیصلے کرتے ہیں جو قرون وسطی کی عیسائیت اور کیتھولک مکتب کے متعلق کئے گئے تھے اور ان کو دہراتے ہیں ۔البتہ وہ لوگ جن کے فیصلے ان کا اپنا کام اور آزاد اور مستقل افکار اور براہ راست ان کی اپنی تحقیق اور شناخت سے نکلے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ گذشتہ سو سال کے سیاسی انقلابیوں اور تحریکوں میں علمائے دین ، مذہب اور مسجد و بازار کا کیا کردار رہا ہے اور انہیں یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں عیسائیت کی طرح روحانیت کا کوئی آزاد شکل یافتہ ادارہ نہیں ہے کہ جس کے

متعلق کوئی عام فیصلہ کیا جاسکے۔

اسلام میں علماء عام لوگوں اور معاشے میں سے قدرتی برگزیدہ افراد ہیں اور ہر ایک کی اپنی آزاد شخصیت ہے اور اس بناپر اسلام میں " روحانیت " کے نام پر کسی " تنہا معاشرے " کے متعلق گفتگو کرنا اور اس کے متعلق فیصلہ صادر کرنا سخت جاہلانہ بات ہے، لیکن باوجودیکہ ان میں انحطاط پذیر، پست اور حتی استبداد شاہی سے وابستہ افراد موجود رہے ہیں۔اس کے باوجود ان کا مقابلہ یورپ میں قرون وسطیٰ کے روحانیت کے ادارے سے منطقی نہیں ہے اس لئے کہ دونوں دو غیر مشابہ اور غیر ہم جنس معاشرتی حقائق ہیں۔

میں جو یہ کہتا ہوں کہ تمام استعمار دشمن اور یورپی ثقافتی حملوں کی مخالف تحریکوں کے اندر جو روح اور رہبری موجود رہی ، وہ علماء اور بڑے اسلامی مفکروں کے ہاتھ میں رہی اور حتی کبھی انہوں نے اس کو اصول بنایا ہے ، تو یہ ایک عینی حقیقت ہے۔

ان تمام اسلامی معاشروں کو جو گزشتہ سو سال میں جدید تمدن سے آشنا ہوئے اور انہوں نے یورپ کے اقتصادی سیاسی اور فوجی مسائل سے سروکار پیدا کیا، نگاہ کریں ، ان سیاہ معاہدوں کو جو گذشتہ ایک صدی یا ایک صدی سے زیادہ میں تدوین کئے گئے اور یہ منحوس استعماری معاہدے جو افریقی اور ایشیائی اسلامی ملکوں اور استعمار کے درمیان منعقد کئے گئے ، یعنی زبردستی ان پر ٹھونسے گئے ، کسی ایک معاہدے کے نیچے کسی ایک بھی عالم دین کے دستخط موجود نہیں ہیں۔

افسوس اور انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ یہ سب کے سب دستخط جدید

تعلیم یافتہ اور " روشن خیال " ، " آج کے " ، " غیر متعصب " اور " غیر مقید جہان شناسی رکھنے والے اور فلسفہ مرکزیت انسان کے حامی ترقی پسندوں اور غیر مذہبی افراد کے ہیں۔

یہاں تک کہ اگر ان علماء کے درمیان سے ایک عالم یہ چاہتا کہ خود کو بیچ ڈالے اور " استعماری معاہدے " پر دستخط کرے ، تو پہلے عمامہ و قبا و عبا کو اتار لیتا ، اور داڑھی صاف کر لیتا اور ہیٹ پہن لیتا ، یورپ کا ایک سفر کرتا اسے دریائے ٹیمز میں " غسل تعمید " (دین ، مسیحت میں داخل ہونے کے لئے غسل) کرایا جاتا ، اس کے بعد واپس آتا اور (استعماری) فعل کا آلۂ کار اور آخر کار ایک جدید نئے ، ترقی پسند ، یورپ نواز ، غیر مذہبی شخصیت کے طور پر دستخط کر دیتا تھا۔

یہ اسلامی مفکر اور راہنما ہی تھے کہ سب سے زیادہ انہوں نے خود اور اسی طرح اپنی روحانی ، معنوی اور مذہبی زبان میں ، جس کے ذریعہ وہ لوگوں اور اپنی نسل سے فکری تفاہم اور تبادلہ خیالات رکھتے تھے ، (برعکس جدید یورپی روشن خیالوں کے) ، اس خطرے کا اعلان کیا کہ یورپ اسلئے نہیں آیا ہے کہ صرف اور صرف تانبے ، تیل ، روئی ، پٹ سن کو لوٹے اور زیر زمین ذخائر اور گراں بہا معدنیات پر ڈاکہ ڈالے بلکہ بیک وقت وہ ہماری تمام انسانی ثقافتی سرمایہ ، اخلاقی فضائل اور روایتی ، مذہبی اور روحانی جڑوں ، شخصیت اور تاریخ کو ، نیز ہر اس چیز کو جو ہماری قومی وجود کو بناتی ہے ، تباہ کرتا ہے ، لوٹ لیتا ہے اور اسے گندی دلدل میں کھینچ لاتا ہے۔

پہلی بار یہ لوگ تھے جو استعمار کے مقابل ڈٹے رہے اور استعمار کے خلاف قومی تحریکوں کے راہنماؤں کے برعکس ، استعمار کے خلاف جہاد کو فقط اقتصادی اور

سیاسی میدانوں تک محدود نہیں کر دیا، بلکہ ان کی ایک فکری، نظریاتی اور معنوی بنیاد اور حامی بھی تھے اور انہوں نے استعمار کو اس کے تمام چہروں کے ساتھ پہچان لیا تھا اور خاص طور پر اس کے حملے کے مخفی ترین اور مہیب ترین بازوؤں یعنی فکری، معنوی، اخلاقی اور علمی بازو یعنی اس کی ثقافت سے الجھ پڑے تھے۔ یہ لوگ مغرب کے مقابل ثقافت اور فکر کے اسلحے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ علامہ اقبالؒ جب مغربی تمدن پر حملہ کرتے ہیں۔ تو وہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے ایک قوم پرست استعمار دشمن کے علاوہ دوسری شخصیت ہوتے ہیں جو مغرب پر حملہ کرتے ہیں تاکہ خود کو اس کے سیاسی و اقتصادی تسلط سے نجات دے سکیں۔ وہ انسان کی راہنمائی کے مدعی ہونے کی حیثیت سے مغرب اور مغرب کے تمدن و ثقافت و فکر پر حملہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر جو انسان کے دشمن ہیں۔ اس تمدن پر جو یہ چاہتا ہے کہ تمام دوسرے تمدنوں اور ثقافتوں کی نفی کرے۔ ان کا انکار کرے اور انہیں پامال کرے۔ وہ زندگی کے اس طرز اور اس فکر پر جو بنیادی طور پر انسان دشمن ہے مغرب پر حملہ کرتے ہیں، ایک قیدی کے طور پر نہیں جو جدوجہد کرتا ہو، کہ خود کو مغرب کی قید سے نجات دے۔

اسلامی معاشروں اور آگاہ و بیدار مصلحین کے ترقی پسند مکاتب میں استعمار کے خلاف جہاد اور مغرب دشمن بصیرت کا دامن وسیع ہے۔ یہ ایک کھلی اور روبہ ترقی جہان بینی پر قائم ہے۔ اس کی بنیاد ایک انسانی نظریاتی بصیرت پر ہے نہ کہ ایک محدود قوم پرستانہ اور سیاسی رجحان پر۔

وہ چیز جسے اور زغان، کاتب یاسین، امہ سیزر، علیون دیپ، جولیس نیرہ اور

سنگور جیسے بڑے معاصر مفکّرین سمجھ گئے ہیں اور ان کے افکار کا ترجمہ آخری دو تین سال کے روشن خیالوں کے لئے بڑا ہنگامہ خیز رہا ہے، وہ سید جمال الدینؒ کے زمانے سے کواکبی اور اقبالؒ تک ہمارے آگاہ مفکروں کے درمیان کام کی بنیاد کے طور پر زیر بحث رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ ہم سے منسوب ہیں اور ہم آدھے تو مومن اور بےخبر اور بظاہر مقدس ہیں اور دوسرے آدھے غیر مذہبی اور جدت پرست اور مشہور قول کے مطابق روشن خیال ہیں اور وہ فرنگی تراجم اور یورپ سے درآمدہ افکار سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے اور ان میں تشخیص اور آزاد شناخت کا فقدان ہے۔

اسلام اور اسلامی ثقافت نے ہر ملت ومذہب سے زیادہ استعمار سے زک اٹھائی ہے۔ استعمار کے مارے ہوئے معاشروں کے ہر مکتب و مسلک سے زیادہ استعمار کے خلاف لڑے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کچھ لوگوں نے چونکہ ادھر ادھر سے یہ سن رکھا ہے کہ یورپ میں مذہبی روشن خیال نہیں ہیں یہ سوچا ہے کہ انہیں بھی مذہب کا مخالف ہونا چاہیے اور جو کوئی بھی مذہب یا کسی بھی مذہب کی کسی بھی زمانے اور صورت میں مخالفت کرے۔ ایک یورپی روشن خیال بن جاتا ہے۔ یہ سبب ہے کہ میں بارہا ایک ایسے نظریے کو زیر بحث لایا ہوں جو اصلی روشن خیالی کی بنیادوں میں سے ہے، مگر اس نے بغیر پڑھے اور بغیر سنے اور سمجھے اس کی مخالفت کی ہے صرف اس بنا پر کہ یا تو اس میں اسلام کا نام لیا گیا ہے یا صرف اس وجہ سے کہ اس نے یہ سنا کہ میں مذہبی رجحان رکھتا ہوں۔ میری زیادہ تر کتابوں کو ان لوگوں نے جلد دیکھتے ہی مسترد کر دیا ہے!

سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ایک روشن خیال نے جو میری دلیل کو رد نہیں کر

سکتا تھا اور اس نے ناچار قبول کر لیا تھا، لیکن یہ کہا آپ کی یہ بات کہ اگر ہم اپنی ثقافت اور روبہ ترقی اسلامی فکر کی بنیاد کی طرف واپس چلے جائیں، ہمارا معاشرہ آزاد اور ارتقاء یافتہ شخصیت حاصل کرلے گا درست ہے اور آپ یہ جو کہتے ہیں کہ یہ جو موجود ہے وہ خرافات ہے جو مسخ شدہ اسلام سے مخلوط ہو گیا ہے صحیح ہے اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ حقیقی اسلام ایک زندگی بخش، معاشرتی اور آگہی بخش اور روبہ ترقی مذہب ہے اور اگر اس کی روح اور ثقافت کی، جو ہمارے درمیان ہے، احیاء کی جائے تو ہم مغرب کی یورش کے خلاف کھڑے ہو سکتے ہیں اور انسانی اور معنوی آزادی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور عوام کو جو مذہبی ایمان رکھتے ہیں اس طاقت کے ذریعے حرکت اور بیداری کی ترغیب دے سکتے ہیں، یہ بھی سچ ہے، اور ہم قبول کرتے ہیں کہ اسلام حقیقت ہے اور وہ بھی ایک لازم، مفید اور ہماری ضروریات کے مطابق حقیقت لیکن کب تک ان گمراہ کن افکار اور موجودہ مخلوط اسلام کو الگ کر کے حقیقی اسلام کو زندہ کر سکتے ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ بہتر نہیں کہ ہم کہیں کہ سرے سے دین ہی کو ایک طرف رکھ دیں اور پھر جب اس کو ایک کونے میں رکھ دیں، تو لوگوں سے صاف اور سیدھے سیدھے کہہ دیں "راستہ یہ ہے اور کنواں وہ رہا؟" میں نے اس سے کہا اس وجہ سے کہ کوئی کام "مشکل" ہے، کوئی سبب نہیں کہ ہم اس کو چھوڑ دیں۔ اگر کہتے ہو کہ اسلام درست ہے، حقیقت رکھتا ہے، ایک روبہ ترقی، قیمتی اور واقعی فکر ہے، تو ہم خودبخود اس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کہوں جناب میرا ایک دین ہے، ایک مکتب ہے، جو درست ہے، واقعی اور علمی حقیقت ہے، لیکن میں اسے مسترد کرتا ہوں اور قبول نہیں کرتا چونکہ موجودہ معاشرے اور حالات کے اندر اس کا احیاء اور اجراء مشکل ہے

اور بہت لمبا عرصہ لگتا ہے ۔ لہذا ناچار اسے جڑ سے مسترد کر دیتے ہیں اور ایک ایسی فکر اور کسی دوسرے اعتقادی مکتب کے پیچھے جاتے ہیں جو آسان ہو ، اور جسے جلدی سے رائج کیا جا سکتا ہو!

آپ مجھ سے کہتے ہیں " بیسویں صدی میں جو بے دینی کی صدی ہے ، کیا اس میں دین کے راستے لوگوں کی اور ملت کی خدمت کی جا سکتی ہے اور معاشرے کی اصلاح اور موجودہ معاشرتی حالت میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور فکر کو بیدار کیا جا سکتا ہے ؟

عجیب بات ہے ! کتنی بڑی غلطی ہے ؟ بیسویں صدی سے مجھے کیا ۔ ہمارے روشن خیال تقویمی زمانے اور معاشرتی زمانے کو ایک سمجھتے ہیں!

تقویمی نقطہ نظر کی رو سے تمام انسان جو اس وقت سانس لے رہے ہیں ہم عصر ہیں اور بیسویں صدی میں زندہ ہیں ۔ لیکن سب کے سب بیسویں صدی میں زندگی نہیں گزار رہے ۔ پہلا کام جو ایک اصیل روشن خیال (نہ اس مقلد کے ترجموں کی ادائیں رکھنے والے) کو کرنا چاہیے یہ ہے کہ اپنے معاشرہ کے " معاشرتی زمانہ " کا تعین کرے ، یعنی اس بات کو سمجھے کہ اس کا معاشرہ کس مرحلہ اور کس صدی میں زندگی گزار رہا ہے ؟ اسی بیسویں صدی میں بہت سے معاشرے ایسے ہیں کہ تاریخ میں داخل نہیں ہوئے اور تاریخ سے قبل دور میں زندگی گزار رہے ہیں ۔

یہ بہت سادہ لوحی ہوگی کہ ہم خیال کریں کہ مثلاً ایک ایسا معاشرہ جس میں جاگیر دارانہ نظام ابھی تک موجود ہے اور ابھی اس کی مشکلات عام جہالت یعنی رسم الخط کا نہ ہونا اور آئین اور معاشرتی جمہوری روبہ ترقی اداروں کا نہ ہونا ہوں ، بیسویں

صدی میں زندگی گزار رہا ہے اور اس جگہ میں ہم دفتر شاہی "جمہوریت ، نظام مشین سرمایہ داری ، پرولتاری طبقے اور فلسفی نافرمانی اور عالمی طبقے اور دیگر بیسویں صدی کے معاشرے کے خاص مسائل پر گفتگو کریں!

بیسویں صدی کا معاشرہ! مجھے تو اپنے معاشرے کی صدی سے کام ہے ۔ مجھ روشن خیال کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نہ تو میں انیسویں صدی کے جرمنی میں ہوں اور نہ بیسویں صدی کے فرانس میں اور نہ پندرہویں اور سولہویں صدی کے اٹلی میں ، میں مشہد ، تہران ، اصفہان ، تبریز ، قم اور خوزستان میں زندگی گزار رہا ہوں ۔ یہ ایک حقیقت ہے ۔!

حقیقت پسند ہونے کے یہی معنی ہیں کہ معاشرتی فیصلوں کو دنیا کے روشن خیالوں کی کتابوں سے نہیں ، بلکہ عوام الناس کے درمیان سے نکال کرلانا ، کتاب کے متن کو نہیں لوگوں کے متن کو پڑھنا ، مجھے اس سے کیا کام کہ صدی غیر مذہبی ہے میرا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے خواہ میں مذہبی ہوں ، خواہ مذہبی نہیں ہوں (افرادی فلسفہ کی بصیرت کے طور پر) اگر میں روشن خیال ہوں تو مجھے اس معاشرتی اور معاشرتی علوم کی عینی حقیقت کا معترف ہونا چاہیے ۔

ہمارے زیادہ تر روشن خیال اپنے ذاتی عقاید کو معاشرتی حقائق سے خلط ملط کر لیتے ہیں چونکہ وہ خود مذہب کے مخالف ہیں تو معاشرتی اور سیاسی کاموں میں بھی معاشرے کو مذہب کا مخالف گردانتے ہیں ۔ حقیقت پسند روشن خیال معتقد تصوّریت نہیں ہوتا ہے یعنی وہ شخص جو اپنے اندرونی عقیدے اور ذہنی رجحان کو معاشرے کی عینی حقیقت سے نہ سمجھ بیٹھے ۔

میں دیکھتا ہوں کہ میری ملت کی معاشرتی روح مذہبی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ استعمار اور اس کے ایجنٹ کبھی تو اس پر انحصار کرتے ہیں اور کبھی اس کے خلاف شدید جنگ کرتے ہیں۔

انگریزی استعمار کا بانی قرآن کو زمین پر مار کر چیخا، کہ "جب تک یہ کتاب موجود ہے مسلمانوں کے درمیان ہمارا اثر و نفوذ محال ہے"۔ میں جانتا ہوں کہ ترقی پسند روشن خیال کو اپنے معاشرے کی ثقافت، روح اور شخصیت پر اعتماد کرنا چاہیے اور اس مقام سے اپنی تحریک کا آغاز کرنا چاہیے، میں جانتا ہوں کہ ہماری قومی ثقافت ایک اسلامی ثقافت ہے۔ جانتا ہوں کہ اسلام (مذہبی نقطہ نظر سے اس پر ایمان رکھوں یا نہ رکھوں) معاشرتی، سیاسی اور طبقات دشمن عناصر سے پر اور اس کے پاس دنیا کی بصیرت اور جہاد و رزم کی ثقافت ہے۔

اس بنا پر میرے معاشرے میں اسلام عوام کا ایمان بھی ہے، معاشرتی مضبوط قوت ہے اور تاریخ بھی ہے اور قومی ثقافت بھی ہے اور اپنی ذات میں یہ تعمیری، آگاہی بخش، عدل پسند، استبداد دشمن اور اپنے پیروؤں کی انسانی، معاشرتی اور مادی عزت و حرمت کا بھی معتقد ہے۔ ان حقائق کے نہ سمجھنے کا مطلب کسی چیز کو بھی نہ سمجھنا ہے۔

اگر میں جو روشن خیال ہوں، اس عظیم اور لبریز ثقافتی منبع کو باہر نکال کر لاسکوں، اگر ان لوگوں کو جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلامی آشنائی اور آگہی فراہم کر سکوں اور اگر ان کی آنکھوں کو بھی ان دلوں کی طرح اس پر رزم و حرکت مکتب کی تاریخ کے بارے میں جو حرکت اور زندگی کے شعور سے لبریز ہے کھول سکوں، تو میں

نے ایک روشن خیال مفکر ہونے کے ناطے اپنا فریضہ منصبی ادا کر دیا۔

روشن خیال مفکر کا اس کے علاوہ کوئی فریضہ نہیں کہ کسی معاشرے کی معنوی اور قومی ثقافت اور شخصیت کی بنیاد پر اس کو طبقاتی یا قومی خود آگہی و شعور عطا کرے۔ سیاسی راہبری لوگوں کا اپنا کام ہے۔

دیکھئے کہ روشن خیال مفکروں کے اس دماغ نے ہمیں کس طرح کا بنا دیا ہے کہ جب میں ابوذرؓ کی بات کرتا ہوں، جنہوں نے طبقات دشمن کا اور آج کی حقیقی اور علمی معنوں میں انقلابی اور استبداد شکن اور سرمایہ داری کے مخالف سب سے زیادہ ترقی پسند انقلاب کو تاریخ اور مذہب میں شروع کیا تھا جب میں علیؑ کی بات کرتا ہوں جو آزادی اور انسانی رزم، عدالت پسندی اور ظلم و جور اور مذہبی فریب و استحصال کے خلاف انقلابی جہاد کے مظہر ہیں اور حریت اور دلاوری، جانبازی، فکر اور جذبہ کے الہام بخش اور حقیقی سرچشمہ ہیں تو ہمارا روشن فکروں سے مشابہ شخص سر کو جھٹک کر کہتا ہے۔ "جی ہاں یہ مذہبی اور پرانی باتیں کر رہا ہے" (والٹیر کی مانند مثلاً اس نے فلاں راہب کے سامنے جو حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کی لید کی پاکیزگی بیان کر رہا تھا کہا تھا۔

جس وقت وہ خود کمان دار آرش کے متعلق بات کرتا ہے کہ ایران کی سرزمین وسیع کرنے کے لئے سرحد کی حدود کے تعین کے وقت تیر پھینکتے وقت اتنا زور لگایا کہ غائب ہو گیا اور وہ رستم دستان اور سیمرغ اور تہمینہ اور اشک بوس اور کیکاؤس اور سفید دیو اور رستم کے ہفت خوان کے بارے میں بات کرتا ہے تو اس نے اس وقت ترقی پسندی کا کام کیا۔ رزم کی روح پیدا کر دی، قومی، امتی اور ملی

بیداری اور شعور کو وجود میں لایا۔

میں مذہب کی فلسفیانہ حقانیت کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ اسی معاشرتی نقطہ نظر سے آیا آج کے عوام الناس ابوذرؓ کے جہاد پر ایمان لاتے ہیں اور علیؑ کی جوان مردی اور عدل پسندی سے ہوش میں آتے ہیں اور آگہی حاصل کر لیتے ہیں یا زال اور زریر سے ؟ کیا زینب (س) انہیں آزادی و ہمت و ستم کے خلاف جہاد کا درس دے سکتی ہیں یا گرد آفرید ؟

میں قدیم داستانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن میں کہتا ہوں جب آپ روشن خیال لوگ خود قومی بیداری اور معاشرتی خود آگہی و ثقافتی احیاء کے سلسلہ میں قدیم داستانوں اور دور افتادہ و موہوم اور غالباً فراموش شدہ افسانوں کے قائل ہیں، تو آپ لوگ کس طرح ان نزدیک کی روشن اور واضح تاریخی حقیقتوں کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں جن پر عوام کا اعتماد ہے جو ان کی ذات کے لئے شعلہ انگیز اور ان کی روح کے لئے ہیجان انگیز ہیں اور آپ لوگ کوشش کرتے ہیں ان کو دور پھینک دیا جائے ؟

یہ ثقافت ذلت آور اور ذمہ داری ختم کرنے والی نہیں، بلکہ قوت بخش اور تعمیری ہے۔ بڑی سادہ لوحی اور جہالت کی بات ہوگی اگر ہم اس مذہب کے کردار کو، جس پر یہ اتہام ہے کہ تلوار کا مذہب ہے معاشرتی اور استعمار کے خلاف جہاد،اس مذہب کے کردار سے ایک جیسا سمجھیں جس کی بنیاد صلح کل، زہد اور گوشہ نشینی پر ہے اور "صلیب" کا مذہب ہے۔ ہم اس کے حق اور باطل ہونے کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے زیر بحث نہیں لاتے، مگر اگر ہم معاشرے کی قسمت پر اعتقاد رکھتے ہیں تو اس

معاشرے کے بیدار ہونے کی واحد راہ اور وہ تنہا راہ جو اس مذہبی امت کے نیم جان جسد میں روح حیات و حرکت پھونک سکے اور وہ اکیلی راہ جو اس عامل کو جس نے لوگوں کو اسلام اور دین کے نام پر پتھر کی طرح جامد کر دیا ہے ایک متحرک اور ارتقاء پذیر عامل میں تبدیل کر سکے یہ ہے کہ ہم اسی راستے سے وارد ہوں جس سے استعمار وارد ہوا، اس روش پر عمل کریں جس کا تجربہ استبداد اور رجعت پرستی نے کیا اور دونوں کامیاب ہوئے۔

انہوں نے کیا کیا؟ حضرت علیؑ کی تعبیر کے مطابق ان لوگوں نے دین کی کھال کو الٹ کر اپنے جسم پر پہن لیا۔ اسلام کے دشمن کے خلاف جہاد کو بدھ مت اور عیسائی طریقہ کے مطابق نفس کے خلاف جہاد سے بدل کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امام حسینؑ کے ابلتے، گرم اور انقلابی خون کو افیون کا نشہ آور مادہ بنا کر رکھ دیا۔

اگر روشن خیال مفکرین سچ کہتے ہیں کہ استعمار، استبداد اور قدامت پرستی نے مذہب کو لوگوں کے خلاف اپنا اسلحہ بنا لیا ہے تو آپ لوگوں کے فائدے میں اس سے یہ اسلحہ لے کر اسے غیر مسلح کر دیں۔

دشمن کو کس طرح سے غیر مسلح کرتے ہیں۔ اسلحے کو ترک کر دینے، اور قدر، موجودیت اور لوگوں کا اسلحہ کے فائدے کے بارے میں عدم اعتقاد سے یا دشمن کے ہاتھ سے اسلحہ لے لینے اور دوست کے ہاتھ میں دے دینے سے؟

اسلامی معاشرے میں مذہب کے خلاف روشن خیالوں کے جہاد نے جرم، رجعت پرستی اور فریب کار دشمنوں کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس لئے ان کی مخالفت سے مذہبی عوام الناس تو دین سے ہاتھ اٹھا نہیں لیتے لیکن وہ افراد جو

خود کو دین کا محافظ اور اپنی کیفیت کو دین کے ساتھ منطبق کرتے ہوئے دکھاتے ہیں، ان کے پاؤں مضبوط ہو جاتے ہیں اور روشن خیالی اور انصاف پسندی اور آزادی کی تحریک پر حملے میں ان کے ہاتھ مضبوط ہو جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کے روشن خیال شخص کو ان دو اصولوں کو جاننا چاہیے کہ اول یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے اور دوسری بات اسلام ایک معاشرتی اور متحرک رزم ہے، اگر مفکر اپنی تحریک کو عام لوگوں کی معاشرتی اور ثقافتی بیداری اور ترقی کے لئے اس بنیاد پر استوار کر سکے تو اس کی کامیابی یقینی اور فوری ہے۔

سید جمال الدینؒ کو دیکھئے وہ ایک گمنام غریب سید ہیں جو اسد آباد ہمدان سے آتے ہیں بغیر اس کے کہ کسی بھی طبقے، گھرانے پارٹی یا گروہ سے وابستہ ہوں، وہ ایک آوارہ وطن ہیں جنہیں فٹ بال کی طرح اس ملک سے اس ملک میں پھینکا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے زمانے میں جب مغربی استعمار اپنی عالمی سلطنت کے عروج پر تھا اور مشرق خواب خرگوش میں تھا۔ وہ بھی ان اسلامی معاشروں میں جہاں ہر ملک میں شاہ اور ان کے حواری اور ناصر الدین شاہ کی طرح کے کٹھ پتلی حکومت کر رہے تھے۔ اس کے تنہا گلے سے ایک چیخ اور نعرہ گونجا، صور اسرافیل کی مانند اور مسلمان اقوام اپنے کفن پھاڑتے ہوئے، سکوت اور رکود کے قبرستان سے نکل کر شور اور ہنگامہ بپا کر دیتے ہیں۔ یہ تمام طاقت اور اثر و نفوذ کیوں؟ کونسا عامل اس بات کا سبب بنا کہ اس تن تنہا شخص کی آواز دلوں کی گہرائیوں اور سرزمینوں کی آخری حد تک راہ طے کرے؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات تھی کہ مسلمان اقوام نے اس دعوت کی آواز کو ایک اپنے جانے پہچانے شخص کی دعوت کے طور پر محسوس کیا؟

انہوں نے یہ محسوس کیا یہ آواز ان کے قابل فخر پر حیات و رزم ثقافت و تاریخ کی روح کی گہرائیوں سے نکلی ہے؟

یہ اجنبی آواز نہیں ہے۔ بیرونی فکر کی آخری موج کا ترجمہ نہیں ہے۔ یہ آواز اسی آواز کی بازگشتوں میں سے ہے جو غار حرا، مکہ، مدینہ، احد، قادسیہ، المقدس اور جبل الطارق (جبرالٹر) اور صلیبی جنگوں میں گونجتی رہی۔ جہاد و عزت و طاقت حیات بخش دعوت کی آواز ہے جس کی بازگشت اسلام کی پر رزم تاریخ کے کانوں میں گونجتی رہی۔ یہ وہ ندا ہے جو مسلمانوں کے افکار و احساسات کے تار و پود سے آشنائی رکھتی ہے۔ یہ اطمینان بخش اور خیال انگیز ہے۔ اس بنا پر ہر شخص اسے روح کی گہرائی سے سنتا ہے۔ یہ روشن خیالی زبان ہے جو اپنی ثقافت و تاریخ و ملت کی زبان سے واقف ہے۔ یہ ایک ایسی واقفیت ہے جو زمانے اور تقدیروں پر حکمران طاقتوں کے باوجود روشن خیال مفکر کو کامیابی کی توانائی اور امکان بخشتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں یہ عظیم مذہبی قوت سادہ طریقہ سے ایک تعمیری و آگہی بخش طاقت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اگر ہمارا روشن خیال مفکر جانے اور پہچانے تو سمجھ لیتا ہے کہ اسلامی ثقافت ایک باطنی رہبانی، انفرادی اور زندگی معاشرہ کی مادیت سے جدا ثقافت نہیں ہے۔ یہ جہاد کی ثقافت ہے۔ سیاسی ثقافت ہے۔ معاشرتی ثقافت ہے۔ اس کی بنیاد اجتماعی ذمہ داری اور عزت، اقتدار حکومت اور راہنمائی پر استوار ہے۔ یہ دنیا کی طرف رجحان کی ثقافت ہے۔

آخرت تمام مذاہب کا نصب العین ہے لیکن اسلام میں آخرت اس دنیا کی

زندگی کا ہی انعکاس ہے ۔ دنیا سب جگہ آخرت پر مقدم ہے ۔آخرت کچھ نہیں ماسوائے دنیا کے منطقی اور علت و معلولی انجام کے ۔

اقتصاد اصل ہے "آخرت اس معاشرے کی ہے ۔جس کے پاس معاش ہے"۔ (پیغمبرؐ) "جس کے پاس روٹی نہیں ہے اور بھوکا ہے اسے ننگی تلوار سے سب کے خلاف شورش کرنا چاہیے اس لئے کہ سب اس کی بھوک کے ذمہ دار ہیں " ۔(ابو ذرؓ)

اسلام اشرافیت کا مخالف ہے اور عام لوگوں کا دین ہے ۔حکمران طبقات سے صلح ناپذیر جہاد کرتا ہے ۔ ملا (موٹے دماغ والوں) ، مترف (موٹے پیٹوں والے) اور یہاں تک کہ مذہبی طبقہ (احبار و رہبان) سے جو تمام معاشروں اور گذشتہ ادیان میں حکمران طبقات میں سے رہے ہیں ! اسلام کا آخری نصب العین عدل اور دنیاوی مساوات و برابری قائم کرنا ہے ۔ "لیقوم الناس بالقسط " (صورہ حدید آیہ ۲۵) (تاکہ لوگوں میں عدل قائم کرے)

تاریخ اسلام کا فلسفہ دنیا کے اسیر ضعیف اور محکوم لوگوں کی قطعی اور مقدر فتح اور ان کی روئے زمین پر حکومت ہے ۔

" و نریدان نمن علی الذین استضعفو افی الارض و نجعلھم آئمتہ و نجعلھم الوارثین (القصص ۔آیہ ۵) (اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنکو کمزور کر دیا گیا ہے زمین میں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں) ۔

اس دین میں جس کے راہنماؤں اور شخصیات نے جنگ کے میدانوں یا زندان کے گوشوں میں جان دی ہے اور اس دین میں جس کے رہبران بت خانوں اور پہاڑوں کے غاروں میں گل سڑ گئے ، فرق ہے ۔ افسوس کہ ان باتوں کو نہ تو

ہمارے اکثر روشن خیال افراد ہی سمجھتے ہیں اور نہ ہی مذہبی افراد کی اکثریت!

یہ دونوں اسلام کے متعلق ایک ہی قسم کی سمجھ رکھتے ہیں۔ پیغمبرؐ فرماتے ہیں۔" من لا معاش لہ لا معادلہ "(جس کی کوئی مادی زندگی نہیں، اس کی کوئی آخرت کی زندگی بھی نہیں ہیں)۔

وہ فرماتے ہیں " کادالفقران یکون کفرا "۔(فقروغربت کفر کا ہم دیوار ہمسایہ ہے)

ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں " جب فقر ایک دروازے سے وارد ہوتا ہے تو دین دوسرے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے" یہ دین صوفیانہ دین سے مغائر ہے جو کہ یہ کہتا ہے کہ " اپنے اندرون (پیٹ) کو کھانے سے خالی رکھ "

علامہ اقبالؒ کے کام کی عظمت ان مسائل اور اس اسلامی معاشرتی سیاسی و ثقافتی بصیرت کی بنیاد پر ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے مغرب کو نزدیک سے پہچانا اور مغرب کی ثقافت، معاشرہ اور تاریخ سے گہری، براہ راست اور ہمہ جانبہ واقفیت کے ذریعے انہوں نے مغرب زدگی کی قید سے نجات پالی۔

مغرب زدگی سے جہاد کی ایک راہ مغرب کی حقیقی پہچان حاصل کر لینا ہے۔ یہ لوگ جو فرنگی بنا بنے پھرتے ہیں اور یورپی تمدن کے شیفتہ اور شیدائی ہیں۔ اس کو عالمانہ، درست طریقے اور نزدیک سے نہیں پہچانتے، اسی طرح جیسے کہ متعصب اور قدامت پرست رجعت پسند افراد جو مغرب اور مغرب کے تمدن و ثقافت کے متحدہ طور پر اور بقول فرنگیوں کے منظم انداز میں مخالف ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے مغرب میں خود کو آج کی دنیا کے عقلی تفکر کی بلند ترین

چوٹی پر پہنچایا۔ انہوں نے یورپ کی جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت سمجھ لی۔ اقبالؒ ایران اور ایرانی ثقافت سے واقف ہوئے اور ایرانی اسلامی ثقافت میں جو معنویت و لطافت، روح و باریکی اور بصیرت کی گہرائی ہے۔ خصوصاً جو اس کے ادبی جلوہ میں ہے اس کو اخذ کیا۔

اس سے آگے بڑھ کر دیکھیں تو اقبالؒ کے تفکر کی فطرت قومی تفکر ہے۔ جو ساری تاریخ کے دوران احساس کی باریکی، تخیل کی نزاکت روح کی صفائی اور دل کی معنویت اور اشراق والہام ان کی نسلی اور ثقافتی خصوصیات میں شامل ہیں۔ اقبالؒ نے ہندوستان میں، اپنے اس عظیم معنوی سرمائے اور ان ثروتوں اور ایسی روح اور بصیرت کے ساتھ اسلام پر آنکھ کھول کر نظر ڈالی اور اس چیز کی توانائی اور لیاقت حاصل کر لی کہ مکتب اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے اور پراگندہ عناصر کو جمع کر کے اس کی دوبارہ تعمیر کریں۔

علامہ اقبالؒ مسلمان کی ایک ایسی روح ہیں جس کے متعدد پہلو ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کوشش کی کہ اسلامی نظریہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہوئے پہلوؤں کو اور بکھرے ہوئے اعضاء کو زندہ اسلامی پیکر کی صورت میں جو تمام تاریخ کے دوران سیاسی فریبوں اور فلسفیانہ و معاشرتی ضد و متناقص رجحانات کے ذریعے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کی نگہداشت کسی ایک ٹکڑے کے اندر ہو رہی ہے، جمع کریں ان کی شیرازہ بندی کریں۔ دوبارہ اس کی عمارت کی تعمیر کریں ان کا شاہکار نہ صرف ان کی کتاب "مذہبی فکر کی تعمیر جدید" ہے بلکہ اس سے بھی بڑا شاہکار ان کی اپنی نادر، چند پہلو اور کامل شخصیت کا بنانا اور اپنی ذات میں

ایک "کامل مسلمان" کی عمارت کی دوبارہ تعمیر ہے!

وہ ایک "خود ساختہ" عظیم اور گراں بہا شخصیت ہیں۔ وہ کس طرح اپنے آپ کو اسلام کے دئے ہوئے مسلمان کے بارے میں نقشہ کے مطابق تعمیر کر سکے؟

ایک انقلابی کے نئے جنم کی صورت میں ایک عام روایتی ہندوستانی مسلمان زادہ، ایک فرنگی مآب انگلستان کا تعلیم یافتہ جوان، لندن سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والا ہندوستان کا ایک فارسی گو شاعر، ایک نوآبادی (کالونی) ملک میں ایک روشن خیال استعمار کا مخالف جوان بیسویں صدی میں، ایک "کامل مسلمان"، ایک علیؑ صفت مسلمان، میں تبدیل ہو گیا۔

علیؑ صفت کے کیا معنی ہیں؟ یعنی ایک ایسا انسان جو، ان تمام انسانی پہلوؤں کے ساتھ جو عام طور پر ایک فرد میں جمع نہیں ہوتے۔ یہ بات بہت غیر عمیق و دقیق ہو گی اگر ہم علامہ اقبالؒ کو استعمار کا مخالف ایک آزادی پسند اور ترقی پسند مسلمان راہنما کے عنوان سے یاد کریں۔

علامہ اقبالؒ ترقی یافتہ عقلی و فلسفی بصیرت اور ایک ایسے سرمائے کے ہمراہ جو انہوں نے مغرب کے جدید فلسفے اور آج کے یورپ کے پیش رفتہ تعقل سے حاصل کیا تھا اور اس اشراق و الہامی روح کے ساتھ جو ایک ہندی مفکر ہونے کے ناطے ان کی قومی اور ذاتی فطرت میں موجود تھی اور ایسی پرورش و تربیت اور استغراق کے ساتھ جو انہوں نے گہرے ثروت مند اور بلند اور حرکت و حرارت اور اسلامی انقلاب سے بھرے ہوئے عرفان سے حاصل کیا تھا اور اس عقیدت و عشق و معرفت کے ہمراہ جو انہیں مولانا روم ان کی مثنوی، دیوان شمس اور فکر اور ثقافت

بھرے عربی ادب سے تھی اور آخرکار اسلامی فلسفوں ، تاریخ ، اسلامی علوم میں فکری تغیرات کے بارے میں وہ وسیع اور جامع شناخت جو انہوں نے حاصل کی تھی اور خاص طور پر مشق اور تجربہ کے ساتھ وہ عمیق ، گہری اور تمام جانبہ واقفیت جو انہیں جوانی ہی سے براہ راست قرآن کے بارے میں حاصل ہوئی تھی اور وہ اس کی روح ، جذبے اور زبان سے مانوس ہو چکے تھے ، انہوں نے ایک عمیق جہان بینی پالی تھی ۔ اور وہ " فلسفہ خودی " کے نام سے ایک استوار و محکم فلسفیانہ نادر بنیاد تک جو اسلامی ثقافت اور بصیرت پر مبنی تھی ، پہنچ گئے تھے جو بیک وقت کائنات ، انسان اور زندگی کی ان کے لئے تفسیر کرتا ہے ۔

اس مقام پر علامہ اقبالؒ ہمارے لئے ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں جو دنیا اور آج کی دنیا کے تفکر اور اس دور کے تفکر کی بند گلیوں سے واقف ہیں اور ہمیں جو اسی حالت میں تیسری دنیا یعنی پسماندہ یا ترقی پذیر اور متحرک معاشروں سے وابستہ روشن خیالوں کے طور پر مادی کمیابی اور معاشرتی اور اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے رنج اٹھاتے ہیں ۔ ہم عالمی ثقافت و فکر سے متاثر روشن خیالوں کی حیثیت سے جو فکری پریشانی ، فلسفیانہ مایوسی ، اعتقادی بنیادوں کے تزلزل اور تمام اخلاقی اور معنوی معیاروں کی عمارت کے ڈھ جانے اور آج کے انسانیت کے فلسفیانہ اور علمی فکر کی بند گلی سے شدید طور پر متاثر ہیں علامہ اقبالؒ ہمیں اپنے مذہبی اور اسلامی ایمان کی بنیاد پر مطمئن کر سکتے ہیں ۔

دنیا اور انسان کے بارے میں ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے ان کی جہاں شناسی اور فلسفیانہ روش ہمارے لئے ، جو کہ اسلامی فلسفے کو ان کے دو عرفانی اور

قدیم صوفیانہ چہروں کے ساتھ پہچانتے ہیں اور یا ان کو بو علی سینا، ابن رشد، غزالی اور ملا صدرا کے قدیم فکری سانچوں میں اور یا ان کے بلاکوں کے چوکھٹوں اور عام اور موروثی روایت سے پہچانتے ہیں، بہت زیادہ قابل قدر ہے اور اس سے واقفیت بڑی فوری اور حیاتی اہمیت رکھتی ہے۔

اس سے بڑھ کر، علامہ اقبالؒ ایک اسلام شناس ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلام کو ایک مذہب کے طور پر، بغیر اس کے کہ اس کو پہچاننے کی ضرورت محسوس کریں، ایک طرف رکھ دیا ہے اور بے سوچے سمجھے اس کو متہم کر کے اس کو مسترد کر دیا ہے اور اس طرف سے بے فکر ہیں اور بہت غرور کے ساتھ اور فخر کرتے ہیں کہ روشن خیال ہو گئے ہیں، نیز وہ افراد جو اسلام کو اس کے محدود رائج روایتی سانچوں میں جانتے ہیں اور اسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور وہی چیز ان کو سیر کرتی ہے، انہیں اسلام شناسی کی ضرورت نہیں ہے۔

ان روشن خیالوں اور ان مومنوں دونوں کے لئے اسلام عبارت ہے اس سے جو ان تک سینہ بہ سینہ اور روایتی طور پر پہنچا ہے اور ان دونوں کے درمیان صرف یہی فرق ہے کہ ایک اس کا معتقد ہے اور دوسرا اس کا منکر!

مگر ان لوگوں کے لئے جو اس بات کے پابند ہیں کہ جب تک کسی مکتب کو درست اور باریک بینی سے پہچان نہ لیں اس کے متعلق فیصلہ نہ کریں، ان کے لئے جو خود سوچتے اور تشخیص کرتے ہیں اور اپنے عقاید کو لباس کی وضع قطع اور فیشن اور رواج اور یورپی پسند کے مطابق آرائش و رقص و اسباب خانہ اور گاڑی کی مانند انتخاب نہیں کرتے اور ان لوگوں کے لئے جو جدت پسند اور روشن خیال ہونے کے خبط

میں مبتلا نہیں اور ان کے کے لئے جو نہ پسند کرتے ہیں کہ خرافاتی اور موروثی مذہبی ہوں اور نہ یہ کہ مذہبی اطوار رکھنے والوں کے مخالف اور ترجمانی اور تقلیدی مذہب والے ہوں اور آخر میں اصیل اور حقیقی روشن خیالوں کے لئے جو یہ جانتے ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنی ثقافت اور لوگوں کو پہچاننے کے لئے اپنی قوم کے دل کی گہرائی تک راہ پانا دنیا کی متمدن اقوام کے عظیم حصے کی تاریخ کو جاننا اور انسانی تاریخ میں دنیا کی عظیم ترین تمدن و ثقافت کے سمجھنے کے لئے اور بالآخر اس عظیم تحریک کے سبب یا اسباب کو سمجھنے کے لئے جو دنیا میں ظاہر ہوئی نیز انسانی زندگی کے عظیم ترین مذہبی، فکری، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مکاتب میں سے ایک سے واقفیت کے لئے اسلام کو پہچاننا چاہیے، ان کے لئے سائنسی، علمی اور باریک بینی کے راستے اور علامہ محمد اقبالؒ جیسے عظیم مفکر اور جدید فکر والی پرمایہ شخصیت کے ذریعے "اسلام شناسی" ایک چند جانبہ معنوی، معاشرتی، سائنسی، تاریخی اور سیاسی ضرورت ہے۔

یہ ایک خود شناسی ہے کیونکہ ہم جو بھی فلسفہ رکھتے ہوں بہر حال ہم نے اس مکتب اور اس تاریخ میں جنم لیا اور پرورش پائی ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک مصلح اور انقلابی اسلامی مفکر ہیں۔یہی وہ مقام ہے جہاں علامہ اقبالؒ جیسے اسلام شناس مصلح اور مفکر کے کام کی قدر و منزلت اور ان کے کردار کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔وہ اسلامی عالم بھی ہیں اور معاشرتی آگہی رکھنے والے بھی ایک ترقی پسند ذمہ دار روح بھی رکھتے ہیں اور استعمار کے مخالف بھی ہیں۔ اسلامی معاشرے کے روشن خیال افراد جان لیں گے کہ وہ اپنے معاشرتی فرض کی ادائیگی میں کس حد تک اقبالؒ جیسے شخص کی فکر کے ضرورت مند ہیں اور ان کو خود پہچاننا اور ان

کی فکر کو پہچانا کس حد تک مسلمان عوام کی بیداری حرکت، ثقافتی انقلاب اور معاشرتی خود آگہی میں موثر اور کس حد تک اسلامی روشن خیال دانشوروں کے لئے نمونہ ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک استعمار کے مخالف راہنما ہیں۔ بعض تاریخی اور معاشرتی حالات میں ایک خاص موقف اختیار کرنا ایک شخصیت کے تمام پہلوؤں یا کسی مکتب یا کسی فکر نوع اور اصلیت کی پہچان کرانے والا ہو سکتا ہے کسی پسماندہ یا استعمار زدہ معاشرہ میں استعمار کا مخالف ہونا ہی سیاسی رجحان کا واحد نشان دہی کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ انسانی شخصیت اس کے انسانی علم و شعور اخلاقی صداقت، روحانی تقویٰ کے درجہ اور کسی فرد کے مذہب یا مکتب کا نشان دہندہ ہوتا ہے۔

آج کا ایک یورپی کہہ سکتا ہے کہ میں فلسفی، ایک ادیب اور ایک فنکار یا ایک انجینئر یا ماہر اقتصادیات ہوں مگر سیاسی شخص نہیں ہوں، سیاسی مسائل پر غور نہیں کرتا اور سیاست کو میں نے سیاستدان کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔

مگر ایک افریقی، ایک ایشیائی یا امریکی استعمار زدہ ہرگز ایسا اعتراف نہیں کر سکتا اس لئے کہ ایک ترقی یافتہ اور نسبتاً زیادہ صحت مند یا کم از کم فطری معاشرے میں سیاست، معاشرتی اور فکری سرگرمیوں میں سے ایک اختصاصی شعبہ ہے اور کوئی ضرورت نہیں کہ ہر شخص خود کو اس کا پابند محسوس کرے۔

ایک یورپی شخص ادیب یا فلسفی یا ماہر اقتصادیات ہو سکتا ہے اور یہ کہ سیاست کے کام کو سیاسی لوگوں یعنی ان افراد کے سپرد کر دے جنہوں نے خود اور ان کے معاشرے نے اس کام کی ذمہ داری کے لئے منتخب کیا ہے، لیکن ایک پسماندہ

استعمار زدہ ملک میں سیاست ایک ایسی " واجب کفائی " نہیں ہے کہ اس " فن " کے تخصص رکھنے والے اس میں مشغول رہیں ۔

اسلام اعلان کرتا ہے کہ تاریخ میں ادیان حق کا نصب العین انصاف اور عدل کا قیام اور زمام حکومت کو روئے زمین کے (غربت میں) اسیر اور کمزور لوگوں کے حوالے کرتا رہا ہے ۔ یہ نکتہ پہلا سکھانے والا اور غور و فکر دلانے والا ہے کہ اصحاب پیغمبر اسلام (ص) میں سے ہم حتی ایک کو بھی نہیں جانتے جو مسلح مجاہد اور حقیقی و علمی جنگجو نہ ہو ۔ ہر مسلمان خود بخود زندگی میں نہ کہ استثنائی حالات و حوادث میں ایک مسلح طرف دار (اسلام) ہوتا ہے ۔

اسلام واحد مذہب ہے جو صرف وعظ و نصیحت نہیں کرتا بلکہ خود کلمہ کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تلوار بھی کھینچتا ہے ۔ اگر چاہیں کہ پیغمبر اسلام (ص کے لے ایک مجسمہ بنائیں تو یہ چاہیے ہو گا کہ ان کے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں شمشیر ہو ۔ حقیقی مسلمان ہرگز بلا سبب صلیب پر نہیں چڑھایا جا سکتا ۔

غلام احمد قادیانی ، جس نے کوشش کی ہندوستان میں ایک نئی اسلامی تحریک بپا کرے ، اسے ہندوستان پر انگریزی استعمار کے تسلط سے کوئی سروکار نہ تھا اور یہاں تک کہ ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے تعصب کو روکنے کے لئے ان کی موجودگی کو مفید سمجھتا تھا اور اس نے اسلام سے جہاد کو بھی اٹھا لیا ، وہ مسلمانوں کی نگاہ میں نہ صرف یہ کہ کوئی رہبر اور اسلامی مصلح نہیں سمجھا گیا ، بلکہ اس کو ایک مشکوک بدعت گزار ، منحرف گمراہ اور غدار کہا گیا ۔

علامہ اقبالؒ صرف اس سبب سے کہ ایک آگاہ مسلمان اور اسلامی مصلح تھے

ایک استعمار کی مخالف شخصیت بھی تھے۔ہندوستان کی آزادی اور ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھنے کی ان کی کوشش،جو انگریز کی غلامی، رجعت پرستی، انحطاط اور خرافات سے آزاد ہو، سب پر عیاں ہے، اس طرح سے کہ بہت سے لوگ انہیں فقط ایک سیاسی شخصیت اور استعمار کا مخالف آزادی کا طلب گار اور تحریک آزادی ہند میں ایک بہادر ہیرو کے طور پر جانتے ہیں۔وہ استعمار کو اس کے ساری شکلوں میں ہدف حملہ قرار دیتے تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک شاعر ہیں شاید یہ صفت اقبال جیسی سنجیدہ اور عظیم شخصیت کے لئے ہلکی ہو لیکن ہر فن کا وزن اور قدرو قیمت فنکار کے وزن اور قدروقیمت سے وابستہ ہوتی ہے۔

جلال الدین محمد بلخی ، وہ حیرت اور عظمت کی روح جس نے ہمارے آسمانوں کو پر کر دیا ہے اور ہماری تاریخ آج بھی اس کے پیدا کئے ہوئے شور و ہیجان سے لرز رہی ہے، ایک شاعر ہی تھے۔

شاعر ہونے کے کیا معنی ہیں ؟!

اس کے معنی ہیں ایک طرح سے بات کرنے کا فن رکھنا، لہذا ہر شاعر کی قدرومنزلت اس سے ہے کہ وہ کس شے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس فن سے وہ بات کے کہنے کے لئے جس کو لوگوں تک پہچانے اور ان پر اثر ڈالنے سے نثر عاجز ہے کیسے کام لیتا ہے ؟علامہ اقبالؒ ایک ذمہ دار وآگاہ فنکار کا نمونہ ہیں۔آج فن اور اس کے معاشرتی ذمہ داری اور فنکار کی اس زمین و زمان سے جبری آشنائی اور رابطہ کے بارے میں جس میں وہ زندگی گزارتا ہے اور فنی تخلیق انجام دیتا ہے بہت زیادہ

گفتگو ہوتی ہے۔

"عہد کرنے والا ادب" کے معنی ہیں وہ ادب جس نے خود کو جبراً لوگوں کی خدمت میں قرار دیا ہے تاکہ استحصال کرنے والوں اور سرمایہ داری اور بورژوائی تسلط کے خلاف محاذ پر ان کی مدد کرے۔ لہٰذا عہد کرنے والا ادب یورپ میں قطعی طور پر طبقات اور سرمایہ داری کا مخالف ہے اور اس مزدور طبقہ کے ہمراہ اور قدم بہ قدم چلتا ہے جو اپنی آزادی اور کامیابی کے لئے لڑ رہا ہے۔ مگر تیسری دنیا اور خصوصاً استعمار کی شکار دنیا میں یہ ادب ہر چیز سے پہلے استعمار کا مخالف ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے زمانے اور معاشرے کے ایک اہل فن اور ایک ذمہ دار اور عہد کرنے والے شاعر ہیں مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ انہوں نے اپنے اور جذبہ سطح اور فنکارانہ اور ادبی خلاقیت کے دامن کو چند سطحی سیاسی اخباری نعروں اور سستے بیانات کی حد تک گرا دیا ہے۔ ان کے کام میں فنکارانہ عہد کا مسئلہ روزمرہ سیاسی مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک وسیع اور عمیق فکری اور انسانی ذمہ داری رکھتے ہیں جس کا ایک لازمی اور قطعی مسئلہ استعمار کا مخالف ہونا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے افریقی ایشیائی معاشروں میں موجود متعصب اور ایک پہلو والے افراط اور تفریط کے دو گروہوں کے درمیان، جنہوں نے مغرب کے خلاف موقف اختیار کیا ہے، ایک تیسرے گروہ کا اعلان کیا ہے۔

ان دو گروہوں میں سے ایک تو اس بات کا معتقد ہے کہ ہم "سر سے پاؤں کے ناخن تک فرنگی" ہو جائیں اور مغرب کے مقابلے میں کسی انتخاب کو اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کا تمدن، اس کی ثقافت، اخلاق، فلسفہ، فکر، فن اور اس کی

زندگی کا جدید قرینہ واحد ہم جنس ، ناقابل تفکیک و تقسیم بناوٹ ہے ، اس کو یکجا اکٹھا اور مکمل طور پر قبول کیا جانا چاہیے اور ہم لوگوں میں اس سے مغایر و مختلف جو کچھ بھی ہے اسے یکجا اور مکمل طور پر دور پھینک دینا چاہیے ۔

ایک گروہ اس طرف پڑا ہوا ہے اور مغرب سے ہر قسم کے اقتباس و تحصیل کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے ،یہاں تک کہ موٹر کار پر سوار ہونے یا جدید تعلیم حاصل کرنے والے ڈاکٹر سے رجوع کرنے کو بھی خلاف شرع جانتا ہے ۔ مغرب کو اس طرح سے یکجا اور مکمل طور پر اس کے تمام مظاہر اور ثقافت کے ہمراہ مسترد کر دینے کا خیال حتی چین کی پارٹیوں ، ہند اور جاپان کی بعض پارٹیوں اور خصوصاً یہودی دینی پیشواؤں کے درمیان موجود رہا ہے اور آج بھی ہے ۔ مگر علامہ اقبالؒ مشرقی اور مغربی بصیرت ، طرز زندگی ، تمدن اور ثقافت کی تنقید اور ان کے افکار کی کیفیت کے تجزیے اور تنقید سے ابتدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

شرق حق را دید وعالم را ندید　　　　غرب عالم را بدید از حق رمید

(مشرق نے حق کو دیکھا اور عالم کو نہ دیکھا اور مغرب نے جہان کو دیکھا اور حق سے بھاگا)۔

اس کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ مغربی فرنگی تمدن کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا مشرق کی ذلت اور غلامی بھی ہے اور جو کچھ کہ مشرقی ہے اسے ہاتھ سے کھو دینا بھی ہے جس کی انسانیت محتاج ہے یعنی حق پرستی ، شوق ماورائی عشق ، غیب کی تلاش ، فضیلت کی جستجو ، مطلق کامل حقیقت اور وجود کے معمہ کے مقابل مشرق کی روح کی دائمی تشویش اور مغرب اور اس کے طرز تمدن سے قطعی طور پر کٹ جانا ،

جمود میں رہنا اور کمزوری ہے ، یہاں تک کہ یہ اس کے تسلط کے مقابلہ میں اس کی غلامی کا قبول کرنا ہے ، کیونکہ ایک غیر صنعتی معاشرہ ہمیشہ مغرب کا وظیفہ خوار اور صنعتی استعمار کا خطرہ اسے ہمیشہ لاحق رہے گا۔

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں مشکوک مفکروں کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ مغرب کی سائنس اور صنعت کو نہیں لیا جاسکتا اس طرح کہ اس کے تمدن ، ثقافت اخلاق اور معاشرتی تعلقات اور طرز زندگی کو ایک طرف رکھ دیا جائے ۔ نہ فقط ایسا کیا جا سکتا ہے بلکہ ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو یہ ثابت کرے کہ وہ معاشرہ جو روح کی بلند و بالا عشق و عرفان اور دل کے اشراق (نور) اور پاکیزہ و عمیق ، اخلاقی اور معنوی لذتوں سے ہمکنار ہو ، وہ گائے اور ہل کے بجائے ٹریکٹر نہیں چلا سکتا (اونٹ کے) کجاوے کے بدلے میں جیٹ (ہوائی جہاز) پر سوار ہو اور موم بتی کو دور پھینک کر بجلی کا بلب جلائے ۔

نہ صرف ایسا کام ممکن ہے بلکہ بشریت کی ذمہ داری اور اس کا تصور ان دونوں کا جمع کرنا ہے ۔ انسانیت اسی وقت کامل ہے کہ وہ شخص جو دل کی پرواز اور روح کے معراجوں سے آشنا ہے ہوائی جہاز سے پرواز کرے اور فضا میں بلند ہو اور سیاروں کی طرف سفر کرے ۔ ایسا انسان زیادہ لیاقت و قابلیت رکھتا ہے اور آسمان کی طرف اس کی پرواز انسانیت کے کمال اور اس کی سعادت کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو گی ۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی آگ کو اپنے دلوں میں روشن کریں اور ایمان و عرفان کی روح کو اور اس عظیم انسان پرور عشق کو دوبارہ اپنی جانوں میں مشتعل

کریں تاکہ روح ہستی وجان کے معنی اور فطرت کے راز اور وجود کے انتہائی ہدف سے زیادہ آشنا ہو جائیں اور یورپ کی طرح طاقت و قوت و کامیابی و مادی و صنعتی آسائش و رفاہ کے اوج پر کھوکھلے پن ، تاریک اندیشی ، ایمان کی پراگندگی و فکر کی گمراہی و انحراف سے دوچار نہ ہوں اور مذہب کو اپنے اندر طاقت دیں یہاں تک کہ اس کی طاقت سے اپنے اوپر تسلّط اور قابو حاصل کر لیں اور انسانیت کی نفی کرنے والے رجحانات اور پست اور جرم آمیز خواہشات اور ہوا وہوس اور طمع اور خوفوں اور روح اور مزاج کے ضعف سے رہا ہو جائیں اور آزادی تک پہنچ جائیں اور دوسری طرف سے مغربی دنیا کی پیش رفتہ و ترقی یافتہ سائنس و ٹیکنالوجی اور زندگی کی منطق کو بھی لے لیں ، تاکہ کائنات پر تسلط حاصل کریں اور فطرت کو اپنے لئے مسخر کریں اور ان دونوں کی مدد سے فقروضعف اور فطرت کے قاہر عوامل پر قابو پالیں اور اپنی مادی خواہشات سے بے نیازی کے ذریعے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ممکن ہے ، نوع انسان کے معنوی تکامل اور حقیقت طلبی اور ترقی کو زیادہ تیزی اور ثروت مندی سے جاری رکھیں ۔

جاپان کا تجربہ اگرچہ علامہ اقبالؒ کی تصوری مثال کے لئے کامل مثال نہیں ہو سکتا مگر روشن خیال مفکروں کے ایک گروہ کے روشن خیال مانند استد لال کو تردید کے لئے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اپنی قومی ثقافتی ، اخلاقی شخصیت کی حفاظت کی جائے اور یورپ سے صرف صنعت اور سائنس کو حاصل کیا جائے جاپان کی مثال ایک زندہ عینی اور قریبی مثال ہے ۔

جاپانی عورت پر نگاہ کریں ۔ وہ اپنی ہی بنائی ہوئی ڈیلکس کار کے ساتھ اور آج

کی زندگی کے تمام جدید ترین وسائل کے ساتھ کھڑی ہے جسے اس نے خود بنایا ہے، مگر اسی قدیم زنانہ جاپانی قومی اخلاق اور خصائل کے ساتھ اور دقیانوسی دور کے انہی لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ۔

علامہ اقبالؒ کی یہ آرزو تھی کہ پاکستان بیسویں صدی کے اسلام میں ایک نیا اور بڑا تجربہ ہو وہ ایک ایسا مشرقی ہو جس نے مغرب کے تمدن کو اپنے اندر تعمیر کیا ہے یا یورپی تمدن کہ وہاں مشرق کی روح کو اپنے طاقتور قالب اور وجود میں پھونک دیا ہے۔ ایسا معاشرہ اسلام کا پسندیدہ معاشرہ ہے جیسے کہ وہ خود بھی اسی طرح کے انسان تھے مشرق کا دل مغرب کے دماغ کے ساتھ یعنی ایک مطلع اور نو تعمیر شدہ مسلمان۔

یہ نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت یا مشرق کی ضرورت بلکہ انسانیت کی ضرورت ہے۔ وہ بشریت جس کا نصف مغرب میں ترقی کر رہا ہے اور آدھے نے مشرق میں بلوغت و ترقی حاصل کی ہے اور دونوں ناقص نسخے (مل کر) کامل بشریت بنتی ہے۔ یہ ایک ایسا پرندہ ہے کہ جس کے دو پر ہیں ایک اس طرف اور ایک اس طرف، ایک دوسرے سے جدا ہوئے پڑے ہیں جب تک یہ دو پر ایک دوسرے سے جدا رہ کر پرورش پائیں گے اور قوت حاصل کریں گے اس پرندہ کو زمین سے نہیں اٹھا سکیں گے، (کہ وہ پرواز کر سکے)

اسلام ایک کوشش کا نام ہے ان دو پروں کو، ایک پر شکستہ اور زمین پر گرے جسم سے جوڑنے کا، اس بات کی کوشش کہ یہ دو پر ہم آہنگ اور ہم پیمانہ اور باہم پیوستہ ہو کر یکجا پرورش پائیں۔ مگر افسوس کہ اسلام تو خود بھی اس پرندے ہی

کی تقدیر سے دوچار ہو گیا، اور علامہ اقبالؒ نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعمیر نو کریں۔

یہ وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کی کوشش اور دیگر تمام واقف اور متفکر اسلامی مصلحین کی کوشش کسی ایک مذہب یا خاص ملت کے چوکھٹے میں محدود نہیں ہیں۔ بیک وقت یہ تمام انسانیت کی تعمیر نو اور نئی تمدن کی تعمیر نو اور ایک جدید انسانی و نسل کا بنانا ہے وہ شے جس کی فانون آرزو کرتا تھا۔

آخر علامہ اقبالؒ ایک ایسے نابغہ روزگار مفکر ہیں جنہوں نے سید جمال الدینؒ کے بعد "اپنی خودی کیطرف بازگشت کی تحریک" کو اس عظیم اسلامی امت میں جو خلیج فارس سے شمالی افریقہ اور چین کے کناروں تک پھیلی اور پراگندہ ہے، جاری رکھا۔

خودی کی طرف واپسی کے معنی ہیں اصیل انسانی خودی کی طرف بازگشت اپنی تعمیری ترقی پذیر اور خودآگاہ ثقافتی و فکری قدروں کا احیاء!

خودی کی طرف واپسی، خودشناسی اور خودسازی (تعمیر نفس) کی ایک گہری اور دشوار تحریک ہے۔ اس کا لازمہ یورپ کے تمدن و ثقافت کی پہچان ہے۔ آج کی دنیا کو اس کی تمام برائیوں اور خوبیوں سمیت پہچانتا، نیز تمدن، ثقافت، ادب، مذہب، انسان کی اصلیتوں اور ہمارے تمدن اور معاشرے کے انحطاط اور ارتقاء کے عوامل اور عوام سے تفاہم اور معاشرے کے متن سے ہم آہنگی اور آخر میں ان چیزوں کا احیاء جسے انحطاط نے ہمارے درمیان مار دیا اور استعمار ہم سے چھین لے گیا اور ہمارے اندر منسوخ اور منقلب کر گیا اور یہ ایسا کام نہیں جو امہ سیزر اور فانون کے

ایک دو بالمشافہ گفتگو کو چند ایرانی مصنفین ترجمہ کریں یا چند مقالے لکھیں جس میں روایت کی طرف واپسی کے متعلق ان کی تقلید میں بحث کریں۔

اپنی خودی کی طرف واپسی کس طرح سے ؟ جیسے علامہ اقبالؒ نے واپسی اختیار کی وہ یورپ گئے اور آج کی عالمی سطح کے فلسفی مفکر بن گئے انہوں نے مغرب کی ثقافت و تمدن اور معاشرے کو محققانہ طور پر پہچانا اور اس کے بعد اسلام کی طرف واپس آگئے اور خود کو محنت و کوشش و تفکر و تعلیم و دائمی جہاد، اسلام کے مطالعہ، قرآن، عرفان اور ثقافت کی پہچان، عوام، مملکت اور اسلامی حکومتوں کی سرنوشت، ہندوستانی معاشرے اور عالمی استعمار کی شناخت اور آزادی اور انصاف کے لئے استعمار دشمن جہاد میں سیاسی، ادبی، فنی، فلسفی اور عملی طور پر شرکت کے بعد اور آخر میں خو دشناسی اور معرفت ذات اور تعمیر نفس کے ذریعے اپنی خودی کی طرف واپس آگئے اور خود کو کل اور آج کے تمام انفس وآفاق عالم میں گھما پھرا کر، ایک مشرقی مسلمان اور آزادی پسند مفکر اور اشرقی فلسفی، فنکار مجاہد اور اسلام شناس ادیب بنا دیا۔

یہ ہے اپنی خودی کی طرف واپسی، یہ ہے بیسویں صدی میں رہنا، یہ ہے ایک پسماندہ استعمار زدہ مشرقی اسلامی معاشرے میں روشن خیال ہونا۔ یہ ہے ہمارے زمانے کے فلسفہ، کھوکھلے پن، بیکار خیالی، پریشان فکری کی اس بند گلی میں مکتب رکھنا اور اصیل اور استوار اعتقاد پر مبنی جہاں شناسی رکھنا۔ یہ ہے علیؑ صفت ہونا آخر میں یہ ہیں محمد اقبالؒ، خالص مسلمان، ہماری صدی میں فکر اسلامی کی عمارت کی تجدید کے معمار!

میں قوم پرستی کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلامی کے سخت ترین حریف سیاسی حالات میں ایرانی تفکر نے یہ دکھادیا کہ اس نے حقیقت اسلام کو، اس طرح سے نہیں جس طرح اس کے سامنے پیش کیا گیا، بلکہ اس طرح جیسے اس سے چھپایا گیا، تاکہ تاریخ اس کو بھلادے، پالیا اور ایرانیوں نے آغاز اسلام میں، بنی امیہ اور بنی عباس کے عالمگیر پراپیگنڈے کے باوجود اسلام میں پامال شدہ حق اور اولین راہ کی تشخیص کر لی اور دوسری، تیسری اور چوتھی صدی میں، جو اسلام کے تمدن اور ثقافت کا سنہری زمانہ تھا، ایرانی فطانت، اسلامی تمدن کی ثقافت اور روح اور معنویت کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا اور بقول عبدالرحمن بدوی مصری واحد عامل تھا۔ اور حیرت یہ ہے کہ آج بھی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک اور روح، حرکت اور فکر اسلامی اور خواب آلودہ اسلامی معاشروں کی بیداری کا پہلا بانی اور اس کا پیش قدم سید جمال الدین اسد آبادی ہم میں سے ہیں اور آخر میں اس تحریک کو جاری رکھنے والے عظیم علامہ اقبالؒ کا بھی ہم ایرانیوں سے یہ خطاب ہے:

ای نوجوانان عجم جان من و جان شما — چون چراغ لالہ سوزن در خیابان شما
آتشی در سینہ دارم از نیا کان شما — حلقہ گرد من زنید ای پیکران آب و گل

(میں لالہ کی طرح تمہاری کیاری میں جل رہا ہوں، اے عجم کے جوانو، میری اور تمہاری جان کی قسم، میرے گرد حلقہ بنالو، اے پانی اور مٹی کے جسمو، میں اپنے سینہ میں تمہارے بزرگوں کی دی ہوئی آگ رکھتا ہوں)۔

دوسرا حصہ

ھم اور اقبال

بعض مکاتب ، آثار اور انسانوں کے بارے میں بالکل بات کی جائے ، ممکن نہیں دنیا ان کے بارے میں باتیں کرتی ہے ۔۔۔۔کم و بیش تمام لوگوں نے ان کا نام اور ذکر سنا ہے اور ان کی یاد ہر جگہ دہرائی جاتی ہے ۔ان سے انکار قطعاً نہیں کیا جا سکتا اور ان کے بارے میں سکوت بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا ۔بہر حال ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہیے ۔۔۔یہ بات میں نے قومی افتخار اور رجز خوانی کے لئے نہیں کہی بلکہ اس لئے کہی ہے کہ ہمارے معاشرے کے روشن خیال اور درد مند حضرات اس سے واقف ہو جائیں اور اس کام میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں ۔

ادبی صنعت کیا ہے" گھنٹوں ، سالوں باتیں کرنا ، صفحوں کے صفحے کالے کرنا اور کتابوں کی کتابیں لکھنا ، بغیر اس کے کہ کوئی بات کی جائے جو خود کئی اسلوب رکھتی ہے اور اس کی مختلف انواع و اقسام ہیں اور ان میں سے بعض یوں ہیں ۔ مناقب ، فضائل ، محاسن ، مقامات اور کرامات کو ایک صف میں لانا اور ایسی بلند ترین تعریفوں کو جنہیں شاعروں ، خیال بافوں اور تخیل پردازوں کی قوت تخیل اور سخن وروں کی تخلیقی قوت بنا سکتی ہو ، ان پر نثار کرنا اور ہر کمال و فضل پر ایک کتاب تحریر کرنا ۔

یہ ہے بات کرنے کا فن اور بار بار اور ہمیشہ بات کرنا اور کوئی بات نہ کرنا۔

دوسرا راستہ چہروں کا آدھا رخ دکھانا ہے اور ان کے افکار اور تصانیف کے بارے میں اس کتاب کی طرح بات کرنا کہ جس کے پہلے درمیانی اور آخر کے صفحات گر گئے ہوں۔

یہ سب ہے کہ ان شخصیات میں سے جن کے متعلق سکوت اور خاموشی اختیار نہیں کی جا سکتی اور ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہیے۔ ہم انہیں سنسر شدہ کے طور پر پہچانتے ہیں۔

ان سب میں سے ایک علامہ اقبالؒ ہیں جس کا ادبی رخ شاعری ہے بر صغیر (ہندوستان و پاکستان) کے فارسی گو شاعر جن کا سیاسی چہرہ سفارت پاکستان سے متعلق ہے اور شب اقبال کے عنوان سے گرم، پر شکوہ اور انمٹ یادوں کی حامل وہ محفلیں ہیں جو سالانہ معمول اور ثقافتی تبادلے اور تعلقات کے معاہدے اور خوشگوار ہمسائیگی کے اصول کے مطابق منائی جاتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فارسی گوئی کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ مفکر اور انقلابی پیشوا لوتھر کا دنیائے عیسائیت میں ایک ایسے انسان کے طور پر جو خوبصورت بدن رکھتا تھا اور اس کا خط بھی بہت خوبصورت تھا تعارف کرایا جائے۔

اقبال کا تعارف سچے انداز میں کس طرح کرایا جائے؟ اس سے پہلے ہمیں اپنا تعارف کرانا چاہیے، یہ اس سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ شیخ نے کہا ایک محفل میں میں نے چودہ دلیلیں دیں اور خدا کے وجود کو ثابت کیا۔ شمس تبریزی جواب میں کہتے ہیں اے شخص، میں اللہ کی طرف سے جناب عالی کا شکریہ ادا کرتا ہوں! اے شخص تم

جاؤ اپنے آپ کو ثابت کرو، خدا کو تمھارے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے!

شمس کی ہدایت ایک کلی اور دائمی قانون ہے۔ خدا، مذہب، تمدن، ثقافت نظریہ، شناختیں، ذمہ داریاں، راستے، اہداف، حقوق نیز اشخاص ہماری دنیا کے بڑے مکاتب اور ہماری تاریخ میں کیت و کیفیت کا علم، سب اس وقت ہو سکتا ہے جب فکری سرگرمی، علمی سربندی، بے معنی تحقیقات، کھوکھلا تخیلاتی بے کار و عبث تعلیمات، بانجھ علوم، بے ثمر مشقتیں، بے مقصد جدوجہد، تنقید، جہاد اجتہاد، درد سے خالی اور بے روح ذوقیات، ذہنی انتقالات، لفظی کھیل اور حقیر علمی دکھاوانہ ہوں، اور ان چیزوں سے دور اور بیگانہ نہ کرے جو حقیقت کی تہ میں اور حقیقت کی گہرائی اور زمانے کی چمک، زندگی، انسان، تکلیف اور ایک نسل کی سچی ضروریات سے ہیں تاکہ ہر کام سے پہلے ہم خود کو ثابت کرنے میں لگ جائیں اور دیکھیں کہ حقیقی طور پر ہم کیا ہیں اور جان لیں کہ درست طور پر کیا چاہتے ہیں؟

ہم آرٹس کالج کے محقق نہیں ہیں، ارباب علم و ادب میں سے کسی ایک کی شرح احوال کے بارے میں کوئی "تحقیقاتی رسالہ"، "فاضلہ مقالہ" نہیں لکھ رہے اور نہ "محققانہ تحقیقات" اور "عالمانہ جستجو" انجام دے رہے ہیں۔ مادری زبان سے شدید محبت اور وابستگی کا پر ہیجان جذبہ بھی نہیں، جس نے ہمیں اقبالؒ کی پہچان کا گرویدہ بنا دیا ہو، یہاں تک کہ علمی ضرورت کے رفع کرنے یا دینی احساس نے بھی ہمیں اقبال کی تلاش میں نہیں بھیجا ہے۔

مقصد یہ نہیں کہ آخر میں ہم یہ سمجھیں کہ اقبالؒ کون تھا اور اس کے پاس کیا کیا تھا؟ یعنی علم برائے علم!

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اقبالؒ سے کیا کیا چیزیں لے سکتے ہیں؟ مسئلہ یہ ہے! یعنی "ہدایت" ترقی، فلاح اور انسان کے لئے علم اور اس جگہ پر پھر اس کلی، مجرّد اور عمومی انسان کے لئے نہیں، بلکہ ہمارے لئے جو اس خطے اور زمانے کے اس دور میں اپنی خاص تاریخ، ایمان اور اپنے خاص مقدر کے ساتھ مشخّص ہوگئے ہیں اور دشواریاں اور لاچار اپنی خاص ذمہ داریاں بھی رکھتے ہیں۔

عام انسان کی نہیں، ان انسانوں کے متعلق گفتگو ہے جو ایک امت ہونے کے عنوان سے مشترک تاریخ وثقافت وایمان، درد اور ضروریات رکھتے ہیں اور ناچار اپنے خاص مقدر کی جستجو میں ہیں اور قدرتی طور پر اس خود آگہی نے مخصوص ذمہ داری کو ہماری طرف منسوب کیا ہے۔

ہم ایک لفظ میں یعنی ہم مسلمان۔!

اور اس "ہم" کے وجود کے اثبات کے لئے پہلا قدم ایک "سچی وجودی خود آگہی" تک پہنچ جانا اور اس سوال کا جواب دینا ہے کہ "ہم اس وقت تاریخ میں کس جگہ پر کھڑے ہیں؟ ان سرحد بندیوں، صف آرائیوں محاذ آرائیوں اور سمتوں اور موقفوں کے اختیار کرنے میں ہمارا مقام کہاں ہے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں؟"۔

اگر ہم اپنا "تاریخی مقام" اور "عالمی موقف" کا حقیقی طور پر تعین کر سکیں، تو ہم اپنی درست اور صحیح تعریف کر سکیں گے اور اس مقام پر خود آگہی کا جو احساس ہمیں ہوگا وہ سچا اور صادق احساس ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کو غالب طور پر ہم "خود آگہی" کہتے ہیں وہ خلط ملط اور گمراہ ہے، اس لئے کہ غیر کے وجود کے بہت سے عناصر نے ہمارے

اندر حلول کر کے تلقینی اور تزریقی اور تقلیدی اغراض نے ہماری تاریخی فطرت کو آلودہ کر دیا ہے اور "خود" کی بجائے "غیر" نے ہم میں گھر بنا لیا ہے اور قدرتی بات ہے کہ وہ "خودآگہی" جو استحالہ (تبدیل) شدہ اور غیر میں مبدل ہو گئی ہو اور خود سے بیگانہ ہو گئی ہو ایک جھوٹے احساس سے زیادہ نہیں ہے اور اس احساس کے ساتھ جو درد اور ضرورت اپنے اندر پاتی ہے وہ ذمہ داری جو کندھوں پر اٹھا لیتی ہے، مسائل کے حل کی راہ جو ڈھونڈتا ہے اور انتخاب جو وہ کرتا ہے سب موہوم، بے موقع اور بے معنی ہیں اور بنیادی طور پر درست بھی ہوں، اس میں اور اس کی حالت میں بے بنیاد اور الفاظ کے باریک معنوں میں بیجا و بے موقع ہیں۔

ہمارے تاریخی مقام اور عالمی موقف کو یہ سرحدیں متعین کرتی ہیں۔

مشرق: ہم مشرقی ہیں اور یہ لفظ صرف ایک جغرافیائی نام نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی بصیرت، جذبے اور رجحان کو بیان کرتا ہے جو ہماری ثقافتوں، تمدنوں، مذہبوں، طرز جہاں بینی زندگی و ہماری نوع انسانی میں منعکس ہوتی ہے اور اس وقت یہ وابستگی ہمیں اس کے مقابل جس کا نام "مغرب" ہے مشخص اور واضح موقف بخشتا ہے۔

اسلام: ہم مسلمان ہیں۔ اسلام ہر چیز سے پہلے ہمارے لئے ایک اعتقادی مکتب اور ایک معیّن ایمان اور نظریہ ہے، لیکن اس نظریے میں جو نیا نیا بنایا گیا ہو، اور تازہ تازہ کسی ملت کی جانب سے انتخاب کیا گیا ہو، اور اس نظریے میں جس کے ہمراہ ایک ملت نے صدیوں زندگی گزار دی ہے، فرق ہے۔

یہ وجہ ہے کہ اسلام ہمارے لئے، اسی حالت میں تاریخ، زبان ثقافت،

بصیرت ، اخلاق ، معاشرتی روابط ، جذبہ ، طرز عمل ، ایک قسم کی جہان بینی اور انسان اور زندگی سے قبول کرنا ہے ۔

یہ وجہ ہے کہ اسلام " حقیقت " کے علاوہ ، ہماری ثقافت و فطرت کے اجتماعی وجدان اور معاشرتی تعلقات میں ایک " حقیقت " کی صورت میں موجود ہے اور وہ ذمہ دار روشن خیال افراد جو یہاں تک کہ اس کی ایک " حقیقت " کے طور سے نفی کرتے ہیں ، ایک سخت اندھے پن سے دوچار ہوئے ہیں ۔

اگر اس کی " زندہ اور موجود حقیقت " کو معاشرے وثقافت اور ملت کی تاریخ میں روح اور جوہر سے انکار کریں ، اور یہ نہ جانیں کہ اسلام نہ تو ایک " مابعدالطبیعاتی عقیدہ " جسے دماغوں سے صاف کریں ، نہ ثقافت میں کوئی عنصر اور تاریخ میں ایک واقعہ اور نہ ہمارے معاشرے میں کوئی عمارت ، جسے بغیر کسی ضرر اور خطرے کے تباہ برباد کر سکیں ، اور نہ ہی ہماری انسانی شخصیت پر کوئی لباس کہ جب وہ پرانا ہو جائے تو اسے اتار دیں ، اور اسے نئے اور فیشن کے مطابق لباس سے بدل دیں ، بلکہ اسلام اس کے علاوہ کہ ایک نظریہ ہے ہمارے لئے تاریخ کا مافیہ . ثقافت کی روح اور خصلت ، طرز زندگی ، انفرادی اور اجتماعی طرز عمل ، اجتماعی روح اور آخری جہان کے متعلق ہماری خاص دریافت ، ہستی سے ہمارا رابطہ ، نیز ہماری اقدار کی عمارت ، انسانی اساس اور وجود کی فطرت کی تشکیل دینے والا ہے اور بے شک ذمہ دار ، روشن خیال شخص بخوبی واقف ہے کہ عظیم اسلامی معاشرے میں ہمارے لوگوں سے اسلام دور کرنا ، ایک المناک قرقی ہے جو انہیں نو دولتئے معاشروں اور نئی تعمیر شدہ بے رگ و ریشہ اور خالی ملتوں اور کیفیت زندگی میں مدد

کے لئے محتاج اور تقلید غیر پر مجبور ہونے تک گرادیتی ہے۔

جدید ترکی کا تجربہ نیز نئے رسوم اختیار کرنے والی نسل کی قدر وقیمت کا تعین جو اسلامی معاشروں میں ایمان اور اسلامی ثقافت سے کٹ گئی ہے۔ متمدن دنیا اور مغرب کی ترقی یافتہ ثقافت سے ملحق ہو گئی ہے۔ایسے معاشرے میں جو اسلام سے تخلیق یافتہ تاریخی، ثقافتی، اخلاقی مافیہ سے خالی ہو چکی ہے۔ ہمیں ہمارے لوگوں کے چہرے دکھلا سکتی ہے۔وہ چہرے جو ہر واقف انسان شناس، روشن خیال شخص کو جو معنی دل رکھتا ہو، ہر چند غیر مذہبی، نفرت اور خوف وہراس میں ڈال دیں۔

ایک ایسا مفکر جو ذمہ داری سے عاری ہو، اسلام پر اپنا ایمان ترک کر دینے سے اپنے آپ کو اسلام سے آزاد کر سکتا ہے، مگر وہ روشن خیال فرد جو اپنے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے اور قوم کی آگاہی، ہدایت اور تنظیم کا ذمہ دار ہے اور لوگوں کے ساتھ تفاہم وابستگی اور رشتے کی تلاش میں ہے اور ناچار تاریخ، ثقافت، زبان اور اپنی قوم کی شناخت کا محتاج ہو، اور معاشرے کی روح، عوام کی فطرت اور اس کے احساسات، قدروں اور رجحانات میں گھل مل جاتا ہے اور سچے طور پر اپنے لوگوں کے اندر اخلاص، صداقت اور صمیمیت سے سرشار ہو کر زندگی گزارتا ہے اور ان کے ہمراہ سانس لیتا ہے اپنی آنکھوں کو اس گہری اور توانا واقفیت سے جس کی جڑیں لوگوں کی تاریخ، روح اور ضمیر کی گہرائی میں ہیں، بند نہیں کر سکتا اور مجرّد اندیش فلسفی کی طرح جس چیز کو پسند نہیں کرتا ہو، بیباکی اور لاپرواہی سے دور پھینک دے اور اپنے وجود کو اطمینان بخش دے۔

مسلمان ہونا، ان دو اعتبارات سے، ہمیں دوسرے نظریات کے مقابلے میں

جو انسان کو دعوت دیتی ہیں ایک خاص موقف بخشتا ہے ۔ نیز ہماری تاریخ اور ثقافت کو واضح کر دیتا ہے ۔ایسی تاریخ جو ہماری حرکت کے راستے کو معین کرتی ہے اور ایک ایسی سرگزشت کو جو ہماری تقدیر کی پیش بینی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور ایک ایسی ثقافت کو جو ہماری معاشرتی اور انسانی سرشت کو تخلیق کرتی ہے ۔

تیسری دنیا: ہم بہرحال تیسری دنیا کا جزلاینفک شمار کئے جاتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم نے انتخاب نہیں کیا اور اس بنا پر نہ تو ہم اس سے انکار ہی کر سکتے ہیں اور نہ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں ۔

مگر آج تیسری دنیا کوئی سیدھا سادہ نام نہیں ہے جسے جغرافیائی سیاست دان اپنی زبان پر لاتا ہے ، اور یا ایسی جغرافیائی سرحد نہیں جو اسے مغرب کی سرمایہ داری اور مشرق کی مارکیسٹ سے جدا اور مشخص کرے ، بلکہ اس طرح سے جیسے کہ فانون کو اس کی جستجو اور تلاش تھی اور پرجوش انداز میں اس کی آرزو کرتا تھا چل کے ایک تیسری راہ کے مفہوم کو حاصل کرے اور زیادتی کرنے والی دودنیاؤں کے مقابل جو روحانی انسان کی تمام امنگوں کو ناامیدی کی سمت کھینچ لے گئی ہیں ایک اور کوشش اور تجربہ ہو ، اور اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ آج "تیسری دنیا" نے اپنے مصداق کی بہ نسبت ایک وسیع تر اور سنجیدہ تر مفہوم پا لیا ہے اور ہرچند کہ یہ دنیا پسماندہ اور عقب افتادہ ممالک سے مل کر تشکیل پائی ہے اور وہ طاقت ، دولت ، اسلحہ ، صنعت جو اس کے دو ہمسائے رکھتے ہیں ان سے محروم ہے لیکن یہ دو ایسے بڑے خزانے رکھتی ہے جن سے وہ دو ثروت مند اور طاقتور دنیائیں عاری ہیں ۔ ایک تو عمیق اور ثقافت بھری عظیم انسانی ثقافت کی میراث ہے اور دوسرے ان دو حریفوں

کی شکست کا تجربہ ہے کہ ایک نے تو "آزادی" سے قارونی خزانہ پالیا اور دوسرے نے برابری کے ذریعہ "قصر فرعونی" حاصل کر لیا، اور دونوں نے انسان سے ذلیل غلام اور صرف کے بت کی درگاہ میں کھوکھلے اور پلید پیروکار بنائے۔

بیسویں صدی:

اس سب کے باوجود ہم، ہمارے روشن خیال افراد بھی، اور ہمارے عوام الناس بھی، اس بیسویں صدی میں زندگی گزار رہے ہیں اور کم و بیش مجبوراً اس سے وابستہ ہیں۔ بیسویں صدی سے میرا مقصد نظاموں، نظریات، روابط و حالات، فکری ثقافتی، اخلاقی، خصائص اور تمام دشواریوں، بندگیوں، شکستوں، کامیابیوں، برائیوں، اچھائیوں اور خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے۔ جسے ہمارا زمانہ اور ہمارے زمانے کے انسان کی زندگی اس دنیا میں بناتے ہیں۔

اس طرف جمہوریت، حریت پسندی، آزادی افراد اور حرمت حقوق انسانی کا دلدلی کیچڑ میں دھکیلا جانا ہے اور اس طرف بلند و بالا امنگوں اور آج کے انسان کی فطری، حیاتی اور معاشرتی ضرورت کا دلدلی کیچڑ میں دھکیلا جانا یعنی سب لوگوں کا زندگی کی تمام نعمتوں اور فطرت کے سرمایوں، انصاف و مساوات سے نفع اٹھانے میں تمام لوگوں کا شریک ہونا ہے۔

یہ ہے معاصر انسان کے پانچ صدیوں کی جدوجہد اور دو بڑے انقلابیوں کا حاصل! اس نے خدا کی پرستش کو جو تمام مطلق و عالی انسانی قدروں کا مظہر ہے چھوڑ دیا، تاکہ کائنات میں اس توانائی سے، جو اس پر حاکم ہے، آزاد ہو جائے اور عالم وجود

سے تعلق میں بھی اس کی آزادی محدود نہ ہو ، اور خدا پرستی سے نکل کر زر پرستی میں جا گرا ، اور آزادی ، جس کی صدیوں کے بعد پاک ترین خونوں سے آبیاری ہوئی تھی ، اس کے پھل کو سرمایہ داری نے چنا اور موٹی ہو گئی اور عورت نے بڑی تکلیفیں اور رنج اٹھا کر پردہ اور (چادر دیواری کے) حرم کو دور پھینک دیا تاکہ ، اپنی آزاد اور انسانی شخصیت اور اہلیت کو دوبارہ پالے ۔ وہ جنس اور جاہلیت کے بے حرمت بازار کی پلید کھلونا بن گئی لذت پرستی مفلوج سازی اور فریب کا آلہ کار (بن گئی) اور اس کی تمام تر قدروں کا انحصار اس کے نچلے اعضاء (بن گئے) ۔

اس نے ایمان کو حصول علم کی امید میں ہاتھ سے دیا ، اور علم کو دین کی خدمت سے آزاد کر دیا ۔ علم اس کو کھوکھلے پن ، شک اور تاریک فکری کی طرف کھینچ لایا اور اس نے اس کی تمام امیدوں ، قدروں اور ایمانوں کو اس سے لے لیا اور ادھ راستے میں اس کو گمراہ اور بے پناہ کر کے چھوڑ دیا اور خود طاقت اور زر کی خدمت میں لگ گیا اور غیر جانبدار اور بغیر سمت کے اور انسان کے مقدر کے متعلق اور مخلوق کی بے چارگی و گمراہی و رنج کے سلسلہ میں بری الذمہ ہو گیا ۔

اب اس دور کی مجروح روح اور ناامید انسان کی تلخ درد ناک اور دلخراش چیخ کو سنا جا سکتا ہے جب اس زمین کے دو دوزخوں کے مابین شکنجہ میں کسا جا رہا ہے ، وہ چیخ جو اس عصر کے ایک مصنّف کے حلق سے نکلی ہے جس نے اپنی عمر کو آزادی اور اشتراکیت کی دو بہشتوں میں جلایا اور سلگایا اور تمام عالم کے بادلوں کی رعد برق کو جو اس کی روح کے اندر روتے ہیں ، اس کی گفتگو کی آواز میں محسوس کیا جا سکتا ہے ، (وہ کہتا ہے) ۔

"۔۔۔۔۔ وہ سب لوٹ آئے ہیں، خونی اور خاک آلود پنجوں کے ساتھ، قبرستان سے آئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی پہچانا نہیں جا سکتا اور ناچار ان کا ایک دوسرے سے امتیاز بھی نہیں کیا جا سکتا، سب کے چہروں پر نقاب چڑھے ہیں۔ ان نئے ظہور میں آئے جانوروں کے نقاب جو وحشت اور غرور سے درندوں کو بھی بھگا دیتے ہیں۔ کیا تباہ و تاریک دنیا ہے! نہ پانی، نہ آئینہ اور نہ ستارے کی نگاہ، انہوں نے "تنہائی"، "امید" اور یہاں تک کہ گزرے ہوئے لوگوں کی اچھی یادوں کی نوازش کو بھی ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"جوانی کے دھوپ بھرے "تپتے دن! وہ دن جب ہماری شبستان کی چھت پر ایک قندیل کی طرح روشن تھا اور تاریکی اور سردی کو جلاتا تھا اور ہم اس کے نیچے عشق کے کیا کیا قصے بیان کرتے اور دماغ میں کیا کیا امنگیں اور آرزوئیں پروان چڑھاتے۔ اس کل کی آرزو کہ جس میں، میں اور تم اپنی روٹی کو آپس میں تقسیم کریں، آرام سے سانس لیں اور محبت کریں اور خدا کی، جو خوبی و خوبصورتی و حقیقت مطلق ہے اور زندگی اور اس جہان کو معنی دیتا ہے، عاشقانہ طور پر پرستش کریں۔

"مگر ۔۔۔۔ اب وہ خونی اور خاک آلود پنجوں کے ساتھ قبرستان سے لوٹ آئے ہیں۔ عشق، آزادی، مساوات، آگہی، صلح، عوام، خوبصورتی، خیر، حقیقت، کمال، ایمان اور قدر کے الفاظ سے ایک مرثیہ بناؤ خدا کے لئے اور انسان کے لئے ① مگر خدا

---

1. Chandell , (AHD) Les murmurs d. une ame solitaire, Paris, Rosas, P. 27

" لا یموت " ہے اور انسان اس کا ہم پیمان وہم عہد اس کی روح کا حامل ، اسکی طرف صاحب رسالت ، اور آخر میں اس معنی دار اور مقدس فطرت میں اس کا جانشین ، جو خدا کی قدرت ، عقلمندی اور حسن کا آئینہ ہے اور ایک ایسا زندہ و خود آگاہ پیکر ہے جو خدا کی روایات پر گردش کرتا پرورش پاتا ، جنا جاتا اور جنتا ہے ۔

...... اور اس طرح دنیا میں یہ خدا صفت آزاد و آگاہ اور خلاق انسان جس کے قدموں میں سب فرشتے سجدوں میں گرے ہیں اور زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اس کے مسخر ہیں جو حقیقت ، حسن و خیر کو دانش و ہنر و اخلاق سے شکار کرتا ہے جو عظمت کی تعریف کرتا ہے اور قدروں کی پرستش کرتا ہے ، اور آزادی کو تلاش کرتا ہے اور " عالم آگہی " سے " خود آگہی " اور اس سے " خدا آگہی " تک پہنچتا ہے اور پھر روزمرہ زندگی گزارنے سے " ابدیت " اور " کثرت " سے " وحدت " اور " نمائشوں " سے " ذات " اور " دنیا " کے پست رجحان سے دیکھنے ، سوچنے ، انتخاب کرنے ، جانے اور زندگی گزارنے اور ہونے میں .... " آخرت کی دور اندیشی اور بلند رجحان ، " معاش " سے " معاد " کو اور " شرک " سے " توحید " کی طرف جاتا ہے ① اور تمام عمر ہر رات اور دن پانچ مرتبہ میں سے ہر بار جب حق کی سلطنت کا ڈنکا بام عرش پر بجایا جاتا ہے وہ ہر تکبیر کے ساتھ تمام جھوٹی عظمتوں اور ذلیل کبریائیوں کی تحقیر کرتا ہے اور ہر بار تاکید کے ساتھ " اس " سے مخاطب ہو کر اور تمام طاغوتیوں کے لئے اعلان کرتے ہوئے اور خود کو الہام کرتے ہوئے یہ تکرار کرتا ہے کہ : خاص حمد و ثنا ، تعریف ، نہ جبار اور لئیم ارباب کے لئے مخصوص ہے ، بلکہ رب رب رحمٰن و رحیم

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو : " معراج و اسراء " " انقلابی خود سازی " کی کتاب میں ۔

ہمدردی اور تقدیری ہم آہنگی اور آخر میں ایک توحیدی نظریے کے طور پر اس کی اولین بنیادوں پر مذہبی اور اسلامی بصیرت کی عمارت کی تجدید کے متعلق گفتگو کی اور علامہ اقبالؒ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی علامہ اقبالؒ کے متعلق گفتگو نہیں کی، لیکن یہ سب اقبال ہی تھے جو بات کر رہے تھے۔

سنت ابراست کہ گیرد از بحر آب   باز ھمی سوی بحر قطرہ باران برد

(بادل کا طریقہ یہ ہے کہ سمندر سے پانی پالیتا ہے اور دوبارہ بارش کا قطرہ بحر کی طرف لے جاتا ہے)یہ وہ تمام درس ہیں جنہیں ان مکتب میں سیکھا جا سکتا ہے وہ ہے جس نے سید جمال الدینؒ کے انقلابی بغاوت کو "نظریاتی" بنیاد بخشی اور اس کے میوہ دار اور سرکش درخت کو گہری فکری جڑیں دیں۔

مشرق کی طرف واپسی؟ وہ جنہوں نے ہمارے زمانے سے قریبی گہری اور صحیح واقفیت حاصل کرنے، مغرب کے فکر کی بلند ترین افقوں پر پرواز اور اس مکتب میں جس کے استاد ہیگل، نطشہ، کانٹ اور گوئٹے جیسے ثقافت کے فطین عجوبے تھے، سالہا گھل مل اور سیکھ کر، جدید یورپی ثقافت کے فکر و فلسفہ کے سیسہ کا جسم رکھنے والے ہیرو کو ہمارے خدائی نامہ کے رستم وستان مولانا (جلال الدین رومی) کے قدموں میں لا ڈالا تاکہ عشق کے سورج کے تیر سے اسے اندھا کر دے اور اس نے خود اس "یزدانی پیر" کی ہدایت سے بے روح و بے نور صدا فولادی برج (ایفل ٹاور) کو پیرس میں اور اس کے پتھر سے بنے انصاف کے نابینا مجسمہ کو فرنگ (مغرب) میں چھوڑ دیا۔ اور منار والے آسمان جس کی تمام ہستی ایک "فریاد کا حلق" ہے اور جس کی تمام عمر ہر صبح و شام ایک دعوت کی تکرار ہے یعنی دلدل سے خدا کی طرف معراج انسانی کی دعوت پر

صبح کے راستہ پر قدم رکھا اور صبح کی سفیدی کی چوٹی سے اوپر گیا اور دریچہ فلق سے خود کو عرفان کے سمندر کی بے قرار مضطرب امواج میں پھینک دیا اور مشرق کی طرف لوٹ آیا اور جب ساحل اسلام سے سر نکالا اور قرآن کے سہارے سکون پایا تو کہنے لگا:

" افسوس ان سالوں پر جو میں نے فرنگ (مغرب) میں لا حاصل و بے ثمر ضائع کر دیئے " ①

یورپ کا فلسفہ اور سائنس اور انسانی قدریں، یورپی زندگی اور احساس کی سب بے روح اور آبرو ذہن کے نام کی مصنوعات ہیں وہ ذہن جس کا حساس ترین اور صادق ترین حصہ ایک فوٹو گرافی کا کیمرہ ہے جو فطرت، زندگی، حرکت اور انسان کی ایسی تصویریں کھینچتا ہے جو جان، جوہر اور عشق سے خالی ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں مغربی بصیرت میں نہ صرف سائنس بلکہ فلسفہ، فن، حسن شناسی اور حتیٰ انقلابی نظریات بھی انجام کار ٹیکنالوجی پر آکر ختم ہو جاتے ہیں، تو یہ کوئی حادثہ و اتفاق نہیں ہے۔

مشرقی نظر، نہ صرف انسانی قدروں، روح کے جلوؤں اور حسن و کمال و رفعت کو بلکہ احساس کی فطرت اور مادی مظاہر کو بھی ایک قسم کے ملکوتی منظر اور معنوی آیات کے آئینہ کے طور پر دیکھتی ہے۔

جس شے کو " مادّیت "، " مادّی جبر " اور " مادی شے " کا نام دیتی ہے۔ اسے قرآن " سنت خدا " اور " آیت خدا " کہتا ہے اور اصیل وجود، ارادۂ خود آگاہ، خلّاق قوت

۱۔ اقبال در راہ مولوی از ڈاکٹر اکرم لاہور صفحہ ۲

اور باشعور حرکت کے عنوان سے خدا کے اثبات کے لئے ، اس کا اثبات کرتا ہے اور فطرت کو ایک خود بخود کام کرنے والی اور سنگدل مشین نہیں بلکہ عالم شہادت سے تعبیر کرتا ہے اور اپنی پاک سورتوں کے نام نہ تو فرشتوں اور نہ ہی مافوق الفطرت اور حتیٰ فلسفی اصلاحات پر بلکہ تمام عینی واقعی ، تاریخی ، انسانی ، عملی ، فطری ناموں سے انتخاب کرتا ہے ۔ آفتاب ، رعد ، نور ، دھواں ، طور ، ستارہ ، چاند ، لوہا ، غار بروج ، سفیدی ، صبح ، شب ، زلزلہ ۔

آیا فویر باخ جو کہتا تھا " خدا اپنی بے نیازی اور طاقت کو اپنے پرستاروں کے فقر ، ناداری اور کمزوری سے حاصل کرتا ہے اور انسان خدا کی پیروی اور پرستش میں خود سے خالی ہو جاتا ہے اور اس کا ارادہ مفلوج ہو جاتا ہے اور وہ خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور مارکس جو کہتا تھا : " دینی فلاکت ، آہ ایک بے چارہ وجود ، ایک سنگدل دنیا کا قلب اور ایک بے روح وجود کی روح ہے اور لوگوں کی افیون ہے "؛ کیا درحقیقت انہوں نے ان قطعی احکام کو صادر کرنے کے لئے اس کتاب کی جس پر دنیا کے ہر پانچ افراد میں سے ایک ایمان رکھتا ہے چند چھوٹی سورتیں پڑھنے کی بھی خود کو زحمت دی تھی ؟

وہ محقق جس کا فیصلہ نہ عوام کے طرز عمل (کردار) اور نہ خواص کی گفتار سے ہو ، بلکہ حقیقی اور اصلی متون و قابل استناد اسناد سے براہ راست تحقیق کر کے حاصل کرتا ہے جب وہ مذہب کے متعلق بات کرتا ہے کیا وہ یہ کر سکتا ہے کہ قرآن پر جو کم از کم تاریخ اور مذہبی شناخت کے نقطہ نظر سے ہماری دنیا اور تاریخ کے عظیم ترین ادیان کے تین چار مستند متنوں میں سے ایک ہے ، ایک نگاہ بھی نہ ڈالے ؟

ہم آگاہ، اصیل، اور ذمہ دار روشن خیالوں کو جو دنیا کے اس طرف رہتے ہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس طرف والے بنیادی طور پر ہمیں نہیں سمجھتے اور اس سے بڑھ کر کسی المیے کا وجود نہیں کہ ہمارا روشن خیال فرد اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے ان کی عینک آنکھوں پر لگائے اور اپنی ثقافت، تاریخ اور ایمان کو عینی تمام انسانی مافیہ اور اپنے وجودی تشخص کو سمجھنے کے لئے ان کے ذہنی سانچوں اور ان کے فکری اسلوبوں اور تعبیری اور قبول و تفہیم کی شعوری طور پر اور اس سے بھی بدتر یہ کہ غیر شعوری طور پر تقلید کرے۔

علامہ اقبال دنیا میں ایک قسم کی علاقائی موقف گیری کے عنوان سے شرق زدگی سے دوچار نہیں ہوئے ہیں؟

اقبال اپنی ذات کی طرف واپسی کے ساتھ پیچھے کی طرف اور رجعت پرستانہ سفر کی دعوت نہیں دیتے۔

اقبال مغرب کے خلاف اس تمام شدت اور گرمی سے محاذآرائی کے باوجود قوم پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہوئے اور اس بیماری کو خاص طور پر بیسویں صدی کے آغاز کے جرمنی سے سوغات کے طور پر نہیں لے کر آئے ہیں؟

اقبال اپنے تمام دینی جوش وولولے کے ساتھ جوان میں تھا، قرآں کی سمت واپسی کے نعرے اور ہیگل، نطشہ اور انیسویں صدی کے سائنسی فلسفوں سے دشمنی اور خدا، اسلام، محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسینؑ سے عشق نے انہیں ایک دینی تعصب میں گرفتار نہیں کیا ہے اور اس طرح کی بصیرت، انحرافی محاذآرائی اور رجعت پرستی اور کہنہ پرستی کی تعریف کرنا نہیں ہے؟

خصوصیات کے ساتھ ہمارے لوگوں کے درمیان سے ابھرا ہے اور اس نے فکری، ثقافتی، ادبی اور تشخص اور نتیجے کے طور پر انسانی اور معاشرتی تشخص پایا ہے۔ ہمارا روشن خیال ہمارے معاشرے کے قدرتی اور اس کے تاریخی تغیر اور ثقافتی نشوونمااورترقی سے پیوستہ نہیں ہے۔ وہ ہماری ثقافت، مذہب، اخلاق، فکر، جمالیات، جذبہ، فکر، قدر، تاریخ، معاشرہ اور انسان میں کوئی بھی معنی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بنیادی طور پر ایک خاص قسم کی "سمجھ" کو اس کے دماغ میں اتار دیا گیا ہے کہ جس سے رہائی آسان نہیں ہے اور جب تک اس سمجھ اور اس تبدیل شدہ عقل کو سرطان کے خون کی طرح اس کی رگ جان و دل اور ضمیر سے باہر نہ نکالا جائے اور صحت مند حیات بخش خون داخل کیا جائے تو کوئی بھی چیز تبدیل نہیں ہوگی۔

ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیرو امابانفسم (سورہ رعد آیہ ۱۱)

(اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہیں بدلتی)

اس جگہ "مابانفسہم" کی تبدیلی تعجب انگیز وسعت حاصل کر لیتا ہے۔

اقبال کو سمجھنے کے لئے بھی ہمیں اپنی فرنگی فہم بدلنی ہوگی۔

اسلام بغیر اس کے کہ یہ چاہے کہ تاریخ میں سائنسی قوانین اور معاشرتی عوامل کی نفی کرے، اجتماعی نظام کی قسمت کے تعین اور اس کے تغیر میں واقف کارانہ، آزاد، عمل کی طاقت انتخاب کی صلاحیت رکھنے والے انسان یعنی ذمہ دار انسان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔

اسلام کی زبان میں "ایمان" اور "عمل صالح" پر انحصار کچھ ناقابل تفکیک

صورت میں بار بار آتا ہے جو یہ دکھاتا ہے کہ اسلام معاشرتی حالت کے تغیر کو انسانی کیفیت کے تغیر کا معلول شمار کرتا ہے اور انسانی حالت کے تغیر میں "اعتقادی آگہی" اور "انقلابی عمل" پر انحصار کرتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کے اندر کی اصالت اور عظمت اور ذمہ داری کا وزن، وہ بھی اس کی معاشرتی حالت اور زندگی کی روش اور بنیاد اور اس کی تاریخ تقدیر کے مقابل آشکار ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اسلام ایک ملت کی سرنوشت کے بھاری بوجھ کو انسان کے کاندھے یعنی انسانوں کے ارادہ خود آگاہ پر ڈالتا ہے اور روشن فکر فرد تاریخ میں تبدیلی آور، تعمیری اور راہنمائی کرنے والا فریضہ رکھتا ہے اور نیز اسی کی دلیل سے عہد کرنے والا بھی ہے اور ذمہ دار بھی۔ اسی لئے اسے اپنے معاشرے کی پریشانی غربت، انحطاط اور اسیری کے گناہ کا بار بھی اپنی گردن پر لے لینا چاہیے اسی بنا پر موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے کردار میں اسی کی تجلیل و منزلت معقول اور جائز روا ہے جس قدر فرعونی اور نمرودی کردار میں اس کی سرزنش۔

یہی سبب ہے کہ علامہ اقبالؒ نہ صرف عظیم مفکر، زیرک ترقی پسند اسلام شناس، ایک استعمار دشمن عہد کرنے والے مجاہد اور اپنے زمانے میں مرد حرکت و عمل کے عنوان سے۔

اپنے لوگوں کے مقابل اپنی اصلی جائے انحصار کو اپنی ملت کی ذہنی، روحانی اور وجدانی تغیر (یغیروا ما بانفسهم) انتخاب کرتے ہیں اور وہ لوگ جو معاشرتی عمل کو صرف بدنی عمل یا سیاسی عمل کی شکلوں تک منحصر نہیں جانتے، وہ

بطور عمیق اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ذمہ دار روشن خیال شخص کا بنیادی ترین عمل یہی ہے۔

اقبال پہلے مرحلہ میں ایک خاص اور نادار جہاں شناسی کو پیش کرتے ہیں جس کا سمجھنا جس قدر جدید اسلامی معاشروں کے روشن فکر شخص کے لئے، جس نے اپنی ذہنی پرورش اور فہم وادراک کے سانچوں کو مغربی ثقافت اور نظریہ سے لیا ہے، دشوار ہے اتنا ہی حیاتی بھی ہے۔

یہ جہان شناسی جس قدر نئی ہے اتنی ہی ہماری دیرینہ ثقافت و ایمان کی گہرائیوں میں جڑیں رکھتی ہے اور ہمارے اپنے دورترین معنوی سرچشموں سے سیراب ہوتی ہے۔

جہاں شناسی:

اقبالؒ کی جہاں شناسی کی بنیادی ترین امتیازات میں سے ایک ان کا فلسفے کے خلاف حملہ ہے۔ اسلامی ثقافت کی تاریخ میں یہ موقف گیری بنیاد رکھتی ہے، یونانی فلسفے کا وارد ہونا جس قدر اسلامی فکر وثقافت میں، خاص طور پر تیسری صدی کے آخر میں فاتحانہ تھا اور اس نے نہ صرف ابن سینا، رازی اور ابن رشد جیسے فطین بزرگوں کو شکار کر لیا بلکہ ہماری ثقافت میں تفکر عقلی کی طاقت ورترین رو کو وجود میں لایا۔ لیکن قرآن کی اصیل بصیرت اور جہان شناسی کو بدل دیا اور یہ تغیر اسلامی فکر و ایمان کی حرکت کے راستے کے انحراف میں تعین کنندہ تھا اور اس کا سب سے بڑا اثر اسلام کا تبدیل ہونا، ایک عوامی دعوت اور معاشرتی تنظیم اور سیاسی راہنمائی کے حصول کی

سمت میں انقلابی حرکت اور امامت و انصاف پر مبنی معاشرتی نظام کی تخلیق ایک پیش رفتہ ترقی یافتہ فلسفیانہ، سائنسی ثقافت کی صورت میں تھی۔

اگرچہ وہ تمام گروہ جو حکمت حرکت یا فلفسہ عقلی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ترقی پسند نہ تھے، مگر ایک ہوشیار رانہ، ترقی پسند اور اصیل مزاحمت بھی موجود رہی جس کا مقصد زاویہ نگاہ، طرز فکر و خاص فہم اور اصلی اسلامی جہان شناسی سے وفادار رہنا رہا ہے اور بیک وقت یہ ظاہری متعصبانہ فرقہ واری اور عقلی روشن نگاہی سے خالی غطریسیت سے دور ہے جو صرف "تعبدی" اور تقلیدی ہو اور فلسفے سے اس کا مقابلہ، مذہب میں مطلق عقلی رجحان کی مخالفت نہیں ہے بلکہ "اسلام کی یونان زدگی" کے بانجھ کرنے والے عظیم المیئے کی نسبت گہری خود آگہی سے نکلتی رہی ہے۔

اقبالؒ کا فلسفۂ مخالف موقف گیری ایسی گہری اور اصیل روایت کا نمائندہ ہے جو ہماری فکری ٹکراؤ اور اعتقادی جنگوں کی پوری تاریخ میں تسلسل رکھتی ہے۔ الغرض یہ قدیم لوگوں کے کام کی ایک تقلید اور تکرار نہیں بلکہ اس کا ارتقاء اور ایک ایسی ہوشیارانہ، تعمیری، مثبت اور زندہ ماہرانہ محاذآرائی ہے اس چیز کی بنیاد پر جو ہمارے زمانے میں گزر رہی ہے یعنی ماضی کی یونان زدگی کے خلاف حقیقی اور اصیل مزاحمت کا ایک منصوبہ اصیل فکر و ثقافت کے مقابلے کی شکل میں آج کی غرب زدگی کے خلاف جہاد میں جس سے ہم دوچار ہیں اور مٹ جانے و مسخ ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں۔

ضمیر تڑپ رہا ہے فلاطون میان غیب و حضور　　　ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

کیوں ؟یونانی یایورپی عقلی فلسفے پراقبال کو کیااعتراض ہے۔

وہ ایک " روحانی سفر " کے دوران ڈلنٹے کے الہی کامیڈی کے اسلوب میں معاصر مغرب کے فطین ترین فلسفیوں کی نمائندگی میں ہیگل کو مولانا روم ، مشرق کی سرزمین کے اس رستم دستان سے جنگ کے لئے بلاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مغرب کے فکر واندیشے کے سیسہ کا بدن رکھنے والے اسفندیار ہمارے ہیرو کے تیر سے جو " سیمرغ " سے مدد طلب کرتا ہے اندھا ہو جاتا ہے اور خاک پر گر جاتا ہے ۔ اب ہماری فہم اس راز کے نزدیک ہو گئ ہے جو اقبال کی گفتگو میں موجود ہے ۔ ہماری جہان شناسی مغربی جہان شناسی کی طرح خشک ذہنی صورتوں اور دنیا کے انفعالی انعکاس اور فطرت کی مجرّد وبے روح ، بے جوش و جذبہ تصویریں نہیں ہیں ۔ یہ حقیقت سے براہ راست رابطے کی ایک قسم ہے ۔یہ احتراق (آگ لگنے) کے فارمولے کا انکشاف نہیں ہے ۔آگ پرہاتھ رکھنا ہے!کائنات میں گھل مل جانا ، ہستی کی روح سے جڑجانا اور انسان کا زندگی کے جاری متن اور فطرت کی حرکت میں داخل ہونا یا فطرت کی زندگی اور حرکت کا انسان کے وجود کی گہرائی اور انسانی حیات کے خون میں جاری ہونا اور نتیجے کے طور پر ایک نوع کے جذب اور دو وجودوں کی مقناطیسی کشش میں کھو جانا ، یہ انتہائی چھوٹا جب" بے انتہا بڑے " کے سامنے قرار پاتا ہے اور بقول ویکٹرہو گو: نماز یہ ہے! سائنس نہیں یعنی بیرونی کی اطلاع جو ایک قسم کا کشف وشہود ہے ، اور حیرت کو حاصل کر لینا ، شکوہ ہستی اور حسن فطرت کے احساس کے سامنے حیرت اور آخرکار بے تابی ، خودجوشی ، خود سے گزرنا اور خود شکنی اور خود سے باہر نکل کر پرواز کرنے لگنا اور وصال زندگی کے اصلی مرکز سے پیوستگی حرکت عالم ،

وجود کا تڑپتا دھڑکتا دل، ایک ایسی روح کہ یہ بہت سے نقش والی عظیم فطرت جس کا پیکر ہے۔

ایک نظری سائنس نہیں، کھوکھلی بے جوش وخروش اور تاثیر پذیر ذہنی کھیل بلکہ اس کا ایک عکس بکھیرنے والا اور دگر گوں ساز نور جو باطن کی عجائبات بھری دنیا کو روشن کر دیتا ہے اور اس میں آگ لگا دیتا ہے۔ ایک تباہ کن حملہ آور اور خلاق دانش ایسی دانش جو دنیا کا نقشہ بنا دیتی ہے اور انسان کو ایک اور خلقت بخشتی ہے۔

مرے لئے ہے فقط زور حیدری کافی ترے نصیب فلاطون کی تیزی ادراک
مری نظر میں ابھی ہے جمال و زیبائی کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال ہے بے تاثیر ترا نفس ہی اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

قدیم یا جدید فلسفیانہ جہاں شناسی میں دنیا ایک مجموعہ ہے واقعوں، حقیقتوں، جوہروں، "اعراض"، "ھیولا" و "صورت" و "مادہ" و "مرکب" و "مجرد" و "افلاکی" و "لاہوتی" و "ناسوتی" و "محسوس" و "معقول" و "علت"، "معلول" و "انرجی" و "مثبت بار" و "الیکٹرون" و "پروٹون" و "فوٹون" و "ایتھر" و "حرکات" و "روابط" و "کشش" و "دافعہ" کا اور انسان اس مجموعے کے مقابلے میں ایک "ذہن" ایک آئینہ ہے کہ جو کچھ ہے اور جو کچھ گزرتا ہے اس کی سچی جھوٹی یا ملاوٹی و مبہم و رنگ و زنگ سے ملی ہوئی تصویریں اور ناہمواریاں، آلودگیاں، غبار، دھبے، ریشے، بال، ٹیڑھے پن اور آئینہ کے بے جا ہونے (سب) اس میں منعکس ہوتا ہے اور یہ سائنس ہے، اطلاع (ہے)۔

انسان اور کائنات کا رابطہ، رابطہ "ذہن" و "عین" ہے اور جو کچھ کہ فلسفی، عینی حقیقتیں اور علمی حقائق خیال کرتا ہے جو سوائے اس کی اپنی ذہنیات کے کچھ

نہیں، اسے عالم وجود سے براہ راست سروکار نہیں ہے اس کے ساتھ صاف اور سچا پر خلوص اور صادقانہ (طور پر) نزدیک رابطہ نہیں رکھتا جو کہ بلا واسطہ اور بے پردہ ہو، وہ اپنی سوچوں سے کھیلتا ہے اور اس سرگرم کرنے والے اور فریب دہندہ کھیل کا نام فلسفہ ہے۔ وہ اپنی اور فطرت کی ہستی کا متجسس مخبر ہے مگر بیکار منفی اور منفعل ہے فلسفیانہ آگہی "خبر" ہے۔ خبر روپوں اور کھالوں (ظواہر) کی اطلاع ہے۔ عرفانی آگہی "سوراخ کر دینے والی" اور "کھال شگافتہ کرنے والی" آنکھ ہے کہ اس کی نگاہ نشتر کی طرح اشیاء کے تن میں اور فطرت کے پیکر کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور کائنات کے دل میں اتر جاتی ہے اور ہستی کی روح کو چھو لیتی ہے، وہ نگاہ جو رنگوں میں مشغول نہیں ہو جاتی، چیزوں کے وجود میں سرگرداں و حیران نہیں ہوتی، رویّوں اور واقعات میں ٹھہری نہیں رہتی اور اس قسم کی اطلاعات اور خبروں کا ذخیرہ اس طرح کی پیاس کو نہیں بجھاتا اور فلسفیانہ غرور میں گرفتار نہیں ہوتا۔ وہ "اہل خبر" نہیں بلکہ "اہل نظر" ہے۔ وہ نور کی جان میں آنکھ کھولتا ہے اور حقیقت کے لئے بے قرار ہے نہ اطلاع کے لئے بلکہ وصال کے لئے اور نہ خبر کے لئے بلکہ نظر اسے سیراب کر دیتی ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کے جنون خود ہے صاحب ادراک
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اور یہ اقبال ہی ہیں جو عشق کی پرخون راہ کے مولانا (روم) سے جس کا نور واضح دیکھنے والی مٹی ہے، یہ پوچھتے ہیں:

خاک تیری نور سے روشن بصر — غایت آدم "خبر" ہے یا "نظر"؟

اور وہ جواب دیتا ہے:

آدمی " دید " است باقی پوست است   دید آن باشد کہ دید دوست است
(یعنی آدمی صرف " دید " ہے باقی کھال ہے اور " نظر " وہ ہے جو دوست کی نظر ہو)

اس مکتب کی بصیرت، ثقافت اور خاص کلمات سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے اور اس راہ میں پہلے قدم کی شرط یہ ہے کہ تمام ذہنی سانچوں اور مغربی فلسفی اصطلاحات جو اس میں سخت راسخ ہو چکی ہیں فہم کی گہرائی اور اسلوب منطق سے صاف کریں اور دھوئیں۔

یہ " نظری آگہی " اس " خبری آگہی " کے مقابل کس طرح کی اور کہاں سے ہے ؟ ظاہر کہ یہ آگہی " نظر " کا تحفہ ہے مگر " نظر " جو " دیدہ بینا " کا کام ہے، کیا ہے ؟

اقبال خود اس کے معنی بتاتے ہیں:

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خون   علم حاضر سے ہے دین زار و زبون

" علم حاضر " کیا ہے ؟

یہ " خون کی ندی " جو دیدہ بینا سے جاری ہے کس چیز کو بیان کرتی ہے ؟ " بینائی " اور " خون " کے اس مکتب کے اندر آپس میں کیا رشتہ داری ہے ؟

یہ وہ مقام ہے جہاں مسئلہ شناخت و " آگہی خود " کو " فلسفی علمی " و " عرفانی "، " دینی " جہان شناسی میں دو واضح چہروں کے ساتھ دکھلادیتا ہے۔

فلسفی علمی آگہی اپنی اسی " خبری " سرحد پر ٹھہر جاتی ہے، انسان اور عینی حقیقت کے درمیان ایک رابطہ ذہنی، رابطہ کے عنوان سے عالم و معلوم کے درمیان رابطہ ہے مگر عرفانی دینی جہان شناسی میں علاوہ اس کے شناخت کا جوہر ایک اور رنگ میں ہے، حقیقت کے متعلق خبر پانا نہیں، ذہن میں اشیاء کی صورت کا وجود نہیں

ہے ، حقیقت کا دیدار ہے ، حق کو وجدان کرنا اور اپنے فیصل ارادے میں تجربہ کرنا اور دل کی گہرائی میں پالینا ہے ۔اقبال کی خودی کا راز یہ ہے اس کے علاوہ کہ عرفانی ، دینی آگہی فلسفی ، علمی آگہی کے مقابلہ میں ایک اور نوع سے ہے جو شے اسے مشخص اور واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آگہی کی سرشت تین عناصر " درد " عشق اور عمل سے بنی ہے ۔وہ تین عناصر جن سے ہیگل کا پچیدہ فلسفہ اور فرانسس بیکن کی " خشک علمی آنکھ " محروم ہیں اور جدید زمانے کے باقدرت تمدن کو اس طرح سے سخت ، رو کھا اور بے روح اور ترقی یافتہ آج کے انسان کو سرد، پتھر اور بیک وقت اتنا زیادہ ضعیف اور نقصان پذیر بنا دیا ہے وہ انسان جو مسٹرنل سیمون کی تعبیر میں موت کے پہنچ جانے کے علاوہ کسی چیز کے انتظار میں نہیں ہے ۔

ہم پیدائش اور ہم نسل آگہی ، درد ، عشق اور عمل کے ہمراہ ہے ۔ دردِ رفاہ و آسائش کی جستجو میں انسان اور کمال کی جدوجہد میں انسان کے درمیان سرحد کو نیز دو عقلوں ، دو تمدنوں ، دو ثقافتوں ، دو ہنروں ، دو انواع زندگی اور آخرکار دو متضاد علوم کو متعین کرتا ہے ۔وہ سائنس جو بیکن کی تعبیر میں حقیقت کی طلب میں تھی اور اب طاقت حاصل کرنے میں مصروف ہے ، وہ سائنس جو روٹی کا کوپن دیتی ہے اور وہ سائنس جو جان بخشتی ہے ایسا علم جو جبر کو جنم دیتا ہے اور وہ علم جو نور سے تابندہ ہے ، علم واقفیت شناسی اور علم حقیقت پرستی ہے ۔

علامہ اقبالؒ کی تعبیر میں انسان بوعلی کی مانند آگہی میں متجسس اخباری رپورٹر ہے ، وہ فطرت نام کی چیز کے جنازے پر کھڑا ہے اور جہاں نام کے وسیع قبرستان میں قدم زنی کرتے ہوئے خبر حاصل کرنے اور اطلاعات کو اکٹھا کرنے کے

درپے ہے ۔ اطلاعات کا جمع کرنا اور " علی صفت آگہی " میں انسان ایک بے تاب پیاسا بے قرار قیدی اور ایک عاشق ہے ۔ اپنے دوستوں اور وطن کے ہجر میں پڑا ہے اور اپنی نیستان (بانسوں کے جنگل) کی جستجو میں، حقیقت کو معلوم کرنے، گمشدہ کے پانے، سرچشمہ تک پہنچ جانے اور آخر کار حریم آشنائی تک راہ پانے، دوست کے حرم میں وارد ہونے، میقات میں اس کا دیدار اور میعاد میں حاضری کے درپے ہے ۔

اس مکتب میں علم یہ ہے، درد یہ ہے، عشق یہ ہے اور آخرش فطرت اور ایسے آدمی کی فطرت رکوع و سجود یہ ہیں ① :

گفت پیغمبر رکوع است و سجود　　بر درحق کوفتن حلقہ وجود

اب ہم ایک اور قسم کے فہم کو جو ہماری مشرقی ثقافت میں جڑیں رکھتی ہے اور مذہب کے اصیل جوہر سے رشتہ رکھتا ہے، محسوس کر سکتے ہیں اور سرد، بانجھ و منفعل فلسفیانہ عقل کے سامنے سہروردی کی خوبصورت، گہری تعبیر میں ایک " سرخ عقل " کی بات کر سکتے ہیں، دینی پر شعلہ، جنم دینے والی اور سرگرم عقل جو کائنات کی اصل میں نفوذ کرتی ہے اور دنیا کی روح سے گھل مل جاتی ہے اور پیاسی، بے آرام اور حقیقت کی متلاشی ہے اور باطن میں بھی ایک وجودی انقلاب برپا کرتی ہے اور آدمی کی فطری معاشرتی، طبقاتی اور تاریخی خلقت میں عمیق ترین تبدیلیاں وجود میں لاتی ہے اور اس کے وجود اور زندگی میں حسن، قدر، بلندی و آزادی وجودی کو اندھی جبلی کششوں نفع، ترقی، حیوانی بھوک مٹانے کا جانشین بناتی ہے اور بندر

---

۱ ۔ ملاحظہ درحق کوفتن حلقۂ وجود (وجود کے حلقہ کو حق کے در پر پیٹنا) کتاب خود سازی انقلابی میں (ن) ۔

بنا انسان سے خدا بنا انسان خلق کرتی ہے۔

مگر یہ خدا بنا انسان اپنی زمینی تقدیر کے سبب ایک مٹی کا وجود ہے۔ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو خاک "کیچڑ" اور "سیاہ کیچڑ" سیلاب کے سخت شدہ تلچھٹ سے گوندھا گیا ہے۔ یعنی بندر کے ساتھ ایک گھر میں ہم نشین اور جانوروں کا ہم نسل بیک وقت وہ روح خدا کو اپنے اندر رکھتا ہے اور خدا کی خاص امانت کو ہاتھ میں لئے خدا سے معاہدہ فطرت کر چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے وجود کے ایک "تضاد وجودی" سے اذیت میں ہے اور اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح جب انسان پہلے سے زیادہ خود آگاہ ہو جاتا ہے تو آسائش کی طرف اس کا رجحان و میلان روزمرہ معمولات، زندگی کی لذت، خوش بختی کے سکون و آرام اور سیری اور شکم پری سے راضی ہونے کی عادت پکڑنے کو ترک کر دیتا ہے اور نالاں و پر شکایت زندگی لبوں پر ایک بانسری بن جاتی ہے، اپنے خالی وجود سے آگاہ، اس کی ہستی یہاں رہنے کا غم، پردیسی ہونے کا دردناک نالہ اور خونی راہ کو طے کرنے کا عشق جو اس کے نیستان (بانس کے جنگل) سے جا ملتا ہے (بن جاتی ہے)۔ فلسفۂ آگہی کی انتہا پر جا کر تنہائی کو پہنچ جاتا ہے۔ جدید فلسفۂ موجودیت کو دیکھئے مگر عرفانی خود آگہی جدائی کی بحث کرتا ہے "تنہائی بے کسی ہے" اور فطری بات ہے کہ اس جگہ آدمی "یاس" کو پہنچتا ہے اور یہاں عشق کو۔

اب ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آہ سینہ، سوز سحری جس کے متعلق اقبال گفتگو کرتے ہیں وہ کیا ہے اور کیوں؟

اس مقام پر علم اور عشق دو جہان شناسی کے طور پر اور بنیادی طور پر انسان

اور جہان کے درمیان دو متضاد رابطے زیر بحث آتے ہیں ۔ ہر ایک ایسی خصوصیات کے ساتھ جو دوسرے سے ممتاز ہے ۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات — علم مقام صفات ، عشق تماشائے ذات
علم سکون (و ثبات) عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقرو دین — عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگین
شرع محبت میں عشرت منزل حرام — شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام

جو کچھ اب تک ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی فلسفوں میں رائج ذہنی سانچے اور اصطلاحات مثلاً تصوریت ، حقیقت پسندی ، مادیت ، معروضیت ، موضوعیت ،فلسفۂ موجودیت ، فلسفۂ مرکزیت انسان ، خدا پرستی ، دھریت ، فطریت ان میں سے کسی ایک کا بھی روحانی جہان شناسی میں کوئی مطلب و معانی نہیں ہو سکتا اور یہ کسی شے کو بیان نہیں کرتے ۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اس عام روش کے مطابق جو مغرب نے ہم پر مسلط کی ہے ، اس جہان بینی کو ان ذہنوں ڈھانچوں میں سے ایک ڈھانچہ کے تنگ اور خشک چوکھٹے میں سمو دیں ، تو ہم حقیقت کے ساتھ خیانت کے مرتکب ہوں گے ، کیونکہ اس کو سمونے کے لئے ہمیں چاہیے ناچار اس کے کچھ حصوں کو کاٹ ڈالیں اور مسخ کر دیں ، اس جہان بینی کی سب سے زیادہ بنیادی خصوصیت اس کا " بے ڈھانچہ " ہونا ہے اور یہ انسان اور دنیا کی حقیقت کی نمایاں صفت ہے ۔ لہذا یہ اس انسانی جہان بینی کی حقانیت کی ایک نشانی ہے ۔

درد اور عشق کے علاوہ اس جہان شناسی کا تیسرا اصول عنصر عمل ہے اور

قدرتی امر ہے، کیونکہ درد اور عشق، امن اور مسالمت کے ہمراہ زندگی گزار سکتے ہیں نیز قدرتی امر ہے کہ عمل اس خون آلودہ بنیاد آنکھ کی پذیرائی میں اس سے کہیں عمیق غنی اور بلند معنی رکھتا ہے کہ اپنے مغربی مترادف کے حقیر، جامد اور حقیر تنگ جگہ میں سما سکے۔ مغربی ثقافت میں عمل ایک مشینی، میکانکی اور مصلحتی مفہوم رکھتا ہے جو چالاک ہوش کے مکر سے پیدا ہوا، اور خدمت اور فائدہ اٹھانے کے لئے وہ شے ہے جو مادی تمدن کی تقویت اور جبلی زندگی کے ترقی میں کام آتا ہے مگر یہ انسان کے درد کی دوا نہیں اور وجودی رفعت کی دگر گونی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔

اب دیکھئے کہ علامہ اقبالؒ عمل سے کیا مراد لیتے ہیں؟

انجام خودی ہے بے حضوری ہے فلسفہ وزندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دین سر محمدؐ و براہیمؑ دین مسلک زندگی کی تقویم
دل در سخن محمدیؐ بند اے پور علیؑ زبو علی چند

ہم ایک خونی اور شعلہ در جہان شناسی کے مقابل ٹھہرے ہیں ذوق عملی ایک آتشی اور انقلابی عمل کی بات ہے، عمل جو درد اشتعال عشق کے پھٹ پڑنے سے جنم لیتا ہے اس طرح سے ہے کہ علامہ اقبالؒ عمل کی ایسی تعبیر پیش کر سکتے ہیں جو مارکسی لوگوں کے لئے جو عمل کو یا متوسط مکتبہ صنعیات یا اقتصاد پرستی اور اس کے فلسفیانہ عروج کی صورت میں امریکی عملیت میں سمجھتے ہیں سخت حیرت انگیز ہے، مستی کردار کے اس میخانے میں کردار کی مستی بخش شراب کو کون پیتا ہے؟

مجاہد!

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ افکار — مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوامردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست ، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

جی ہاں " مستیٔ احوال " ، " مستیٔ گفتار " ، مستیٔ افکار اور آخر میں " مستیٔ کردار " روشن فکروں کے چار واضح اور مشخص گروہ ، چار قسم کی متفاوت جہاں شناسی کے ہمراہ ہیں ۔ صوفی ، ملا ، فنکار اور مجاہد ۔

اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر فلسفی کہاں ہے ؟

بے شک اقبال کا جواب یہ ہے فلسفی بنیادی طور پر مست نہیں ہے ہم اس جہاں شناسی میں " درد " ، " عشق " اور " عمل " کے مابین منطقی رابطے کو واضح طور پر پا لیتے ہیں نیز اس سے واضح تر یہ ہے کہ ہم جان لیتے ہیں کہ یہ تین کلام کے وضع شدہ اصول یا فلسفی کے ذہن کی مصلحتی مصنوعات کی قسم سے نہیں جو جہان شناسی کے جدا نہ ہونے والی ذاتی خصائص و خصائل اور وجودی پہلوؤں اور فطرتی خصوصیات ہیں ۔

اس جہاں شناسی کے درست اور براہ راست ادراک کے لئے جسے علامہ اقبال اور آتشیں ، خونی معنی یاب ، حسن شناس ، پر شکوہ حیدری قوت والی بینائی سے تعبیر کرتے ہیں اقبال کی زبان سے واقف ہونا چاہیے ۔ اقبال اس کو دینی جہان شناسی کا نام دیتے ہیں مگر یہ دینی صفت ہمارے لئے کس مفہوم کو القاء کرتی ہے ؟ اگر ہم اس چیز کو جسے مذہبی عوام اور غیر مذہبی یا مذہب کے مخالف عام روشن خیال دین کا حصہ

سمجھتے ہیں ۔ مان لیں ، تو ہم نے نہ صرف اقبال کی بات کو نہیں سمجھا ہے بلکہ اس کا وہ بدترین گھٹیا ، انحطاطی مفہوم جو ممکن ہے لیا ہے ، بلکہ اس کے برعکس مفہوم کو لیا ہے ، نہ صرف غلط فہمی ہے بلکہ نقص غرض ہے کیونکہ آج دو بازو یا گروہ جنہوں نے مذہبی مومنین اور مذہب کے مخالف روشن خیال لوگ کا نام پایا ہے. باوجود اس کے کہ آپس میں شدید تضاد اور فکری تعصب اور یہاں تک کہ علمی تعصب رکھتے ہیں ، فکری تعظیم نظر سے ، وہ بھی مذہبی فکر کے لحاظ سے آپس میں ہم خیال ہیں یعنی دونوں مذہب کو اور تمام عقاید وحکام مذہب کو ایک ہی طرح سمجھتے ہیں ، دونوں بہشت اور دوزخ کو جزا اور سزا ، انہی معنوں میں گلشناور گلخن (آتش خانہ) سمجھتے ہیں ، دونوں تخلیق "آدم" کو اسلام کی زبان میں اسی ابوالبشری صورت میں سمجھتے ہیں کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے مٹی کے صورت میں مجسمہ بنایا اور اس کے بعد اس میں پھونک مارے اور وہ زندہ ہوا ، اور پھر اس نے کہا بیوی چاہتا ہوں ، اور خدا نے اس کی بائیں پسلی سے ایک ٹکڑا جدا کر دیا اور اس سے حوا کو بنا دیا اور اس کے بعد انہوں نے گیہوں کھا یا اور جنت سے خارج کر دیئے گئے ۔

ہمیں چاہیے کہ نہ (ملا کی) دین داری کا فریب کھائیں اور نہ روشن خیال شخص کے تمدن کا فریب کھائیں ۔ ان دونوں کو چھوڑ دیں اور تیسری نگاہ سے (دینی ماخذ کا) متن کو پڑھیں جو دل کی تربیت کرتا ہے اور آدمی کو گہرائی بے نیازی ، حسن ، وجودی ، عظمت اور بلندی بخشتا ہے خودی کے بیج کو جو دنیا کی کیچڑے نما زندگی کی سیاہ کیچڑ میں پوشیدہ ہے پہچان لیں ، آئیں، اسے باہر لائیں اور صاف کریں اور شعاعوں کی انگلیوں کی لطیف زندگی بخش پوروں کی لمس و مہربانی کے نیچے انہیں

پروان چڑھائیں ①

خاموش قبرستان کی مٹی اپنی دنیا اور زندگی کے سرد اور تاریک شبستان کو اس چمک اور گرمی سے گرم اور روشن کریں اور دیکھیں اور جان لیں کہ اس عالم کے خاک کا ہر ایک ذرہ ایک بے قرار لفظ ہے اور معانی کا چشم انتظار اور ہم تو اس آفتاب کے غلام ہیں ۔

علامہ اقبالؒ اس خاص جہاں شناسی کو جس کی ذات کے اندر حسن زیبائی و شکوہ ہے اور درود و عشق و عمل اس کے قدرتی خصائل اور اس کی جوہری تراوشات کو دینی جہاں شناسی کا نام دیتے ہیں اور اس طریقے سے چاہتے ہیں کہ اسے " فلسفی جہاں شناسی " اور " صوفیانہ جہاں شناسی " اور " شاعرانہ جہاں شناسی " (رومانی) سے جدا، اور متشخص کریں جس شے کو وہ فلسفیانہ جہاں شناسی کہتے ہیں ۔ وہ قدر مادی جہاں شناسی کو اپنے اندر رکھتی ہے ، جتنا کہ تصوری جہاں شناسی کو رکھتی ہے اور بیک وقت انہیں اس بات کا بڑا وہم ہے کہ ان کے خداوند متعال پر جو بھروسہ وہ رکھتے ہیں اور عرفان کی طرح کی زبان جو وہ استعمال کرتے ہیں ان کے سبب کہیں ان کے فکری مکتب کو " مذہب ملا " یا " مشرق صوفی " سے مشتبہ کر لیں ۔ کیونکہ اس کے باوجود کہ

---

۱ ۔ سورہ "شمس " ہے ۔ قسم ہے آفتاب اور اس کی شعاعوں کی ، نفس کی اور جو چیز اسے سید ھا لائی پس فجور اور تقوی کو اسے الہام کر دیا اور جس کسی نے اسے (نفس آدمی کی خودی کو) آراستہ اور صاف کیا اس نے فائدہ اٹھایا اور جس نے اسے مدفون اور محبوس کیا اور آزاد ہوا اور سورج کی روشنی سے محروم رکھا ہے ۔بہرہ ہو گیا اور ناکام رہ گیا ۔ ملاحظہ ہو ۔ ۔ "خود سازی انقلابی " ص ۱۳۷ اور " با مخاطب ھای آشنا " ص ۱۵۶ اب ۔

سمت ، پیش رفت (ارتقاء) ، روح فطرت ، دنیا کا ارادہ آگاہ ، کائنات کے نظام کا سورج ، کعبہ طواف موجودات ، تمام نشانیوں کی ذات ، تمام نمائشوں کا وجود ، تمام شہادتوں کا غیب ، حرکات کے قانونی ہونے کی علت ، امور کا معقول و منطقی و علمی ہونا ، اصول تغیرات کا ثابت رہنا ، مظاہر اور واقعات کی وحدت ، رشتہ ، ایک دوسرے سے جڑا ہونا اور ہم آہنگی ، حادثہ اور عبث کا ناممکن ہونا ، ہر حقیقت ہر واقعہ اور ہر صفت کی واضح سمت اور مقرر پیمانہ اور ان کا ہدف رکھنا ، دنیا میں ہے اور آخر میں " ہونے کے معنی " " موجودات کا جوہر " ، فطرت کا ضمیر " ، " نفوس کی میں " ، " جان جہاں " اور اقبال کی تعبیر کے مطابق " عالم وجود کی خودی " خدا ہے "

خدا کو اس طرح سے پالینے کے معنی ہیں جہاں کو اس طرح نہ دیکھنا اور سمجھنا جیسے کہ فلسفیانہ مادیت اور فلسفیانہ تصورات اس کو سمجھتے ہیں اور نیز نہ اس طرح جیسے متکلم اہل قال اسے ثابت کرتے ہیں اور اہل حال صوفی اس کو محسوس کرتے ہیں اور یا بنیادی طور پر ان کا خدا کی اس طرح کی دریافت کے پیچھے جہاں کی ایک اور شناخت ہے ایسی شناخت جو علم طبیعات ، علم کیمیا ، علم طبقات الارض اور علم ہندسہ کی سرحد کی سطح پر نہیں رہتی اور مظاہر کی تفسیر اور ان کے تعلقات اور صفات کی توجیہ پر قناعت نہیں کرتی اور ارادہ رکھتی ہے کہ غیب سے سر ابھارے اور وجود کے راز کو پالے ، اور اس جاری دریا اور وادی حیرت و پر شوکت کے دور اور مخفی سرچشمے تک پہنچ جائے اور حقیقت ، کے نقش پا کو " ابدیت " کے عمیق صحرا کے دل تک لے جائے اور " فطرت کی خودی " سے واقف اور " دنیا کی خودی " سے بے تکلف ہو جائے اور ان سب کے باوجود نہ صرف فطرت خاکی کی تکذیب یا تحقیر نہیں کرتی

اور فطری مظاہر کو نظرانداز نہیں کرتی، بلکہ سائنسی قوانین کو حقیر نہیں سمجھتی۔

ہرچند کہ یونانی مآبی یا تاریخ اسلام میں قدیم مغرب زدگی جس نے فلسفیوں کو، مشرق زدگی جس نے صوفیاء کو اور مسیحت زدگی جس نے زاہدوں کو بنایا اس نے "خدا بین فطرت کی طرف رجحان" اور انسان کی طرف مائل کمال طلب حقیقت بینی کو جو قرآنی جہاں شناسی اور اسلامی انسان شناسی کی امتیازی علامت تھی، ہمارے فہم و ادراک کی گہرائی تفکر اور قدری نظام اور اخلاقی بنیاد میں نفوذ پیدا نہیں کرنے دیا اور ہر ایک نے خود کو اپنے زمانے کے رائج اور جانے پہچانے مکاتب کے حوالے کر دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اسلامی معاشرے اسلامی فریضہ سے جو خدا کا پانا اور فطرت کی شناخت کرنا اور رسول اللہؐ کے نمونہ کے سامنے رکھتے ہوئے مثالی امت کا بنانا تھا، بالکل محروم رہ گئے اور اس سے کلی طور پر بیگانہ رہے۔ دینی جہاں بینی سے اقبالؒ کا مقصد اسلامی معاشروں کو اس نصب العین سے واقف کرنا ہے۔

○○○○○○○